صدیوں کا سفر
نازش حیدری

صدیوں کا سفر

نازش حیدری

(آئیڈیل پیکجر کراچی ۱)

ت 15 روپے

شعورِ زندہ کا شاعر

(پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری مدظلہٗ)

ہم جن کی دستبرد سے زندہ نکل گئے
اے زیست دفن ہیں وہ زمانے کہاں کہاں

لئے چراغِ شناسائی میں جدھر بھی گیا
مغائرت کے دیارِ عظیم تک پہنچا

یہ شاعری نہیں ہے زندگی ہے اور اس کو زندگی سمجھنے کے لئے بھی ایک شعور درکار ہے۔ واہ واہ کر دینا دوسری چیز ہے مگر ایسے تجربوں تک پہنچنے کے لئے شعور کی حاجت ہے جس کا شعور تیز ہے وہی زندگی کو سمجھ سکتا ہے۔ چاہے واقعات میں یا شاعری میں

نازش حیدری اسی شعورِ زندہ کے مالک ہیں اور اُن کا کمال یہ ہے کہ اپنے قاری کے شعور کو بھی جگا دیتے ہیں۔

(پروفیسر) مجنوںؔ گورکھپوری
کراچی

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی
(رئیس شعبہ اردو جامعہ کراچی)

نازش حیدری
فن اور شخصیت

"ادبار اس کی عمارتوں پر چھا چکا اور نکبت و عزت اس کے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر برسنے لگی۔ تاروں کی ننھی ماندی روشنی میں سارا شہر تاریک لبِ مرگ معلوم ہوتا ہے۔ مٹی کے چراغ ضرور جل رہے ہیں لیکن ان کا اُجالا رہگزاروں اور شاہراہوں کے لئے ناکافی ہے اور نہ اس روشنی کو دوبارہ لا سکتا ہے جو کبھی جمنا کے کنارے اور شہر کے قلب میں چراغاں تھی اب تو شہر کسی پٹے ہوئے کتے کی طرح شکست سے بے پرواہ رات کی سیاہی میں بے حس پڑا ہے"۔

(احمد علی۔ دلی کی شام)

مگر دلی کی تاریخ میں تو کئی شامیں آئیں سیاسی طور پر انیسویں صدی میں دلی کی شام کے سایے تاریک تر ہو گئے۔

دلی کی اسی طویل تمدنی شام کے دوران پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ۱۹۱۴ء میں جون کی ۲۸ تاریخ کو جب اتوار کا دن تھا یہ جنگ شروع ہوئی۔ اور جس طرح میرے والد کو یہ تاریخ یاد ہے۔ اسی طرح ۶۲ سالہ نازش حیدری کو یہ بات یاد ہے کہ "میں

یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا۔ وہ پیر کا دن تھا اور فجر کی اذانوں کے ساتھ میری پہلی چیخ ابھری۔ اذانوں کی طرح یہ چیخ بھی توحید الٰہی کی شہادت تھی اور یہ عید الفطر کی صبح تھی"۔

یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یہ جزئیات "وقت فجر" عید الفطر کا دن تاریخ۔۔ یہ سب شاعرانہ تخئیل اور مزاج کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ نازش نے کبھی آہ بھر کے تذکرۂ "دہلی مرحوم" نہیں چھیڑا ۔۔ کم سے کم میرے سامنے ۔۔۔ یہ تخئیل پرست آدمی حقیقت پرست بھی ہے۔ یہ لالوکھیت (کراچی) میں اپنی زندگی اور اپنے وجود کی گواہی دیتا ہے ۔۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ بیتی ہوئی صدیوں سے بہت استوار ہے۔ غم پسند آدمی کسی مریضانہ غم کا شکار نہیں، اس کے غم میں میرؔ کی رواؔ اور فانیؔ کے لہجے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا احترام شامل ہے۔ اسی لئے اس غم پسندی اور علم دوستی کے باوجود وہ ماضی کی تہذیبی خوشبوؤں کا وارث بھی ہے۔

صدیوں کا جگر چیر کے پہنچی ہے جو ہم تک
وہ دُور کے مہکے ہوئے ماضی کی ہوا تھی

محمد خورشید حسن نے جب نازشؔ دہلوی بن کر دِلّی کی ادبی دنیا میں قدم رکھا تو وہ دنیا اپنے ضابطوں کی اس قدر پابند تھی کہ آزادی کی سانس بھی گھٹنے لگی تھی۔ داغؔ کی جانشینی کا قضیہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ بیخودؔ اور سائلؔ دونوں اپنے قصیدۂ کلام اپنے طنطنہ اور اپنے مزاج اور شاگردوں کی فوج کے ساتھ یہ معرکہ لڑ رہے تھے اسی کے ساتھ ساتھ ابھی فارسی کا دخل شرفا کی مجلسوں اور گھروں میں تھا۔ استادی شاگردی کا ادارہ زندہ تھا۔ بے استاد ہونا ایک قسم کی گالی تھا۔ اس گالی سے بچنے کے لئے نازشؔ نے حضرت بیخودؔ دہلوی کے سامنے دامانِ شاگردی پھیلایا

اور فارسی پر غالب کے شاگرد پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی سے اصلاح لینے لگے یہ وہ دور تھا جس کا نقشہ اختر الایمان نے اپنی "نظم" پرانی فصیل میں پیش کیا ہے۔

یہ پرانی فصیل دلی کی فضا ہے۔ زبان کو بت بنا کر اس کی پرستش کی جا رہی تھی اور ~

اُسی اک روئے جاناں، موئے جاناں، کوئے جاناں کو
سمجھتے ہیں کہ معراج تفکر ہے اگر باندھیں

پتہ نہیں کہ میں نے اختر الایمان کے یہ مصرعے صحیح طور پر پیش کیے ہیں یا نہیں مگر ان چند لفظوں میں اس عہد کی شاعری کا احاطہ بڑی حد تک ہو گیا ہے۔ بیخود دہلوی تو خاص طور پر زبان پرست تھے اور قدیم ڈگر سے ہٹنے کو کفر جانتے تھے (اس عہد تک اختر الایمان اور عالی جی نے کھل کر دادِ سخن نہ دی تھی)

نازش دہلوی نے اسی انداز میں لب کشائی کی لیکن ان کی افتادِ طبع اور زندگی کے تقاضے ان کی توجہ دوسری سمتوں کی طرف مبذول کرا رہے تھے۔ نازش کے اضطراب کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے حیدر دہلوی سے مشورۂ سخن شروع کیا اور آج تک اسی نسبت پر نازاں ہیں۔ حیدر دہلوی بھی طریقۂ راسخہ کے شاعر تھے۔ زباں پر انہیں قدرت تھی۔ ان کی شاعری میں حرکت اضطراب اور تبدیلی کا عنصر ہے وہ زبان کے پجاری نہ تھے اور نوجوان نازش نے ان کی رہنمائی میں فن کی منزلیں طے کیں میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس سے میرا مقصد استادی شاگردی کے رشتے کی تضحیک نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی صورتِ حال کو پیش کرنا ہے (ہمارے بیشتر استاد اپنے شاگردوں کو اپنا چربہ بنا دینا چاہتے تھے۔ وہ شاگرد کی انفرادیت کے قائل نہ تھے)۔

حیدر دہلوی اصلاح کو محض زبان و بیان کے سقم دُور کرنے تک محدود رکھتے۔
ہاں تو میں ان کی طبیعت میں اضطراب اور زندگی کے عناصر کا ذکر کر رہا تھا۔
چلیئے نازش کے فن کی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے اُستاد کے چند
شعر دہراتے چلیں ؎

ذرّے ذرّے نے صدا دی کہ یہ دستور نہیں
میں نے جب راہِ طلب میں کہیں آرام کیا
اے خوشا جذبِ تجلّی کہ بہ ہنگامِ جنوں
میں نے جس خار کو دیکھا شجرِ طور کیا
تمہاری گرمیِٔ محفل کے رنگ نے اُڑ کر
کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا

نازش بہت دنوں تک اس پرانی فصیل کے اندر نہ رہ سکے جس کا تذکرہ
اختر الایمان نے پیش کیا ہے ـــــ وہ دلّی سے باہر نکلے اور برِّ عظیم پاک و ہند
کے مختلف علاقوں میں نت نئے تجربات سے گزرے۔ دوستی اور دشمنی کے نئے
آداب سیکھے۔ زندگی کے نئے قرینوں، سلیقوں اور اداؤں سے ان کا واسطہ پڑا
لیکن حیدر دہلوی اُن کے ذہن کے مطلع پر چمکتے ہی رہے اور پھر قیام پاکستان
کے بعد استاد اور شاگرد کراچی میں یکجا ہو گئے۔ میں نے حیدر دہلوی کا کلام
جستہ جستہ پڑھا ہے اور نازش کی دنیائے فن میں زیادہ فرصت کے ساتھ
گھوما پھرا ہوں۔ (نازش صاحب میری اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے کہ
ان کے نئے کلام کا ان کے استاد کے دبستانِ فن سے کوئی علاقہ نہیں ہے ـــ
نازش کی شاعری پر اُن کے تجربات، فکر اور بیتے ہوئے ماہ و سال کی مُہرِ ثبت
ہے ـــ وہ آج بھی اپنے اُستاد کے مدح خواں ہیں) ـــ یہ شخصی وفاداری

نازش حیدری دہلوی کی ذات کی ایسی پہچان ہے جس کا سُراغ اس مفاد پرست دنیا میں اب دوسروں کے ہاں مشکل ہی سے ملے گا۔ نازش کے ہاں وفاداری بشرطِ استواری صرف جزوِ ایماں نہیں بلکہ ان کے قانونِ حیات کی بنیادی دفعہ ہے۔

جب آدمی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا ہے تو خرانٹ ہو جاتا ہے اور اکثر اپنی عملی خباثت کو تجربہ کا نام دیتا ہے۔ نازش کے ہاں تجربے نے غزل کا رُوپ دھار لیا ہے اور اپنی ذات کی حد تک وہ آج بھی بہت معصوم آدمی ہیں ــــ وہ انسان سے مایوس ہونا نہیں جانتے اگر کبھی جذباتی لمحے میں میں نے کبھی کسی مایوسی کا اظہار کیا بھی تو وہ مجھے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ان کی نظر مجھ سے اخترالایمان کے لفظوں میں کہہ رہی ہو ع "آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی"۔

نازش نے زندگی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کیں، انہوں نے زندگی سے کوئی ایسا بڑا مطالبہ نہیں کیا جو ناروا یا نازیبا ہو ــــ وہ نگر نگر بکھرے ہیں مگر ہیں تو شاہجہاں آباد کے۔ انہوں نے بس یہی چاہا کہ مجلسِ یارانِ ریختہ ہو اور وہ ہوں (نازش بہت بے ساختگی سے شعر کی داد دیتے ہیں) مگر زندگی نے تو اُن کی یہ آرزو بھی پوری نہ کی۔ دوست مشاعرے کرتے ہیں غیر مشاعرے کرتے ہیں اور نازش کو سب ہی بھول جاتے ہیں۔ مگر اس آدمی کے ہونٹوں پر کسی کی شکایت نہیں۔ یہ آدمی اپنا جی بُرا نہیں کرتا۔

نازش کے ہاں نہ تو تلخی ہے نہ رقّت ــــ وہ ان دونوں باتوں سے بڑا ہے۔ میں نے اُسے غم دوست کہا ہے اور غم دوست ایسا بھی جس پر کوئی میرؔ و فانیؔ کی تہمت نہ لگا سکے۔ ویسے وہ میرؔ کا اتنا احترام کرتا ہے کہ کلامِ میرؔ کو اپنے کلام میں نہیں بلکہ اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہے:۔

ع   وہ درد میرے دل میں ہے جو ہے کلامِ میرؔ میں

لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا درد اپنا درد ہے۔

ہاں میرؔ و فانیؔ اور ایسے ہی دوسرے اچھے غم دوست شاعروں کی طرح نازشؔ اپنے غم سے بڑا ہے۔ آدمی اپنے غم سے بڑا نہ ہو تو خودکشی کرے یا پاگل ہو جائے۔ غم کو معتدل لہجے میں ڈھالنا غم پر فن کی فتح ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ پہلے نازشؔ کی شخصیت اور ذات کا تعارف آپ سے کرادوں اور پھر اُس کی شاعری کے بارے میں کچھ کہوں لیکن شاعر کی ذات اور فن کی تقسیم کون کر سکتا ہے جو میں کر دکھاؤں۔ دیکھئے اُس کی شاعری کا تذکرہ ذات کے دریچوں سے چہرہ بن کر اُبھر آیا ہے، لیکن میں اس کی شاعری سے دانستہ نظر چرا رہا ہوں تاکہ ان کے بارے میں کچھ اور باتیں کہہ سکوں۔

لوگ اس بات کو المیہ قرار دیتے ہیں کہ کسی شاعر کو ڈاکخانے یا انکم ٹیکس کے محکمے میں عمر بتانی پڑے۔ میرے نزدیک یہ المیہ نہیں اس طرح بہر حال ادب زندگی کا رومان رہتا ہے۔ نازشؔ کا المیہ یہ بات ہے کہ اسے قلم کو وسیلۂ معاش بنانا پڑا۔ نازشؔ حیدری "جنگ" کراچی سے مدتوں وابستہ رہے۔ خبروں کے ترجمے کرتے رہے یا دوسروں کے مراسلات پڑھتے رہے۔ زندگی اس سے بڑا جبر اور کیا کرتی کہ شاعر قلم اور کاغذ کی دنیا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرے۔ (یہ المیہ آج بھی عام ہے ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی جیسے فنکاروں کو صحافت کھا گئی ہاں کوئی احمد ندیم قاسمی اپنے فن کو کالم نویسی کی زد سے صاف بچالے جاتا ہے۔ یا کوئی ابنِ انشا کالم نویسی کو اعلےٰ انشائیہ کی حد تک پہنچا دیتا ہے) نازشؔ حیدری نے اس سزا کے باوجود جلاوطنی کو اپنا مقدر نہ بننے دیا اور اپنی شاعری کو اپنی جائے پناہ بنا لیا۔

،ہمارے روایتی غزل گو نے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کے رنگ اڑ بدلتے منظروں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ نازش حیدری جب پرانی فصیل سے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ہر جگہ آسمان وُہی ہوتے ہوئے وہی نہیں ہے اور زمین کا مٹیالا رنگ کبھی تو ہر جگہ مختلف ہے۔ دلّی میں وہ یک بعدی (یک جہتی) زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی غریب الوطنی نے ان کی زندگی کو سہ البادی بنادیا اور انہوں نے اردو غزل کو فطرت کا تحفہ عطا کیا ہے بیشتر شاعروں کی طرح وہ مناظرِ قدرت کے فوٹو گرافر نہیں مگر ان کی غزل میں فطرت کا ارتکاز دیدنی ہے۔ فطرت سمٹ کر ہمارے جذبات کے رنگوں میں نئے رنگ بکھیر دیتی ہے —
سی پی کی برسات اور جنگل اور دور دور تک پھیلی ہوئی چاندنی نے نازش حیدری کے ذریعے اپنا اظہار ہماری غزل میں یوں کیا ہے :۔

بادل تھے مہیب اور گھنے جنگل کی ہوا تھی
ہر رنگ میں بیدار مرے غم کی فضا تھی !
جذبات کے عالم میں تمہیں ہم نے پکارا
جب چاندنی اوڑھے ہوئے خوشبو کی ردا تھی

مجھے معلوم نہیں یہ شعر کب کہے گئے۔ ممکن ہے کہ یہ شعر کراچی میں کہے گئے ہوں مگر نازش تو اس فضا کے ساتھ ہے وہ تو ان کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن چکا ہے اور یہ کوئی مردہ ماضی نہیں ہے۔ یہ زندہ ماضی ہے جو شاعری کے آئینہ میں بار بار جھلک اٹھتا اور حال کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے نظر آتا ہے دیکھئے نازش کا شعر یاد آیا ؎

ہم آج اپنے تصور میں بار بار آئے
گذشتہ عمر کئی مرتبہ گزار آئے

نازش کے بڑے تجربوں میں ایک تجربہ دوسری جنگ عظیم کے دوران قیامِ عراق ہے انہوں نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا کہ اب انہیں موت تماشا دکھائی دیتی ہے ۔ انہوں نے کئی ایسی راتیں گزاری ہیں جن میں ہر سیاہ رات کائنات کی آخری رات معلوم ہوتی تھی موت انہیں کئی بار چھو چھو کر پلٹ گئی " الزبیر " بہاولپور کے آپ بیتی نمبر میں نازش حیدری کے قلم سے یہ سرگزشت میں نے پڑھی ہے اور ان کی شاعری میں اُس تجربے کی زندہ بازگشت سنی ہے ؎

منجمد تیرگیٔ وقت ہوئی ہے نازش!
شاید اس رات کے بعد اور کوئی رات نہیں

موت گزری ہے مری زیست کو چھو کر نازش
میری تخلیق میں اب جان رہے یا نہ رہے

نازش نے ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب کراچی میں ایسی سیاہ راتیں گزاری ہونگی تو عراق کی وہ راتیں (۱۹۴۱ء) ان کی زندگی میں لوٹ آئی ہوں گی جب موت انہیں چھو چھو کر واپس چلی جاتی تھی اور یوں وہ

؏ گزشتہ عمر کئی مرتبہ گزار آئے

نازش کی غزل ان کی شخصیت کا "بے محابا" اظہار ہے شخصیت کے ساتھ خوابوں اور آرزوؤں کو بھی شمار کر لیجئے، اسی کے ساتھ ان کے مشاہدے نے ان کی غزل میں ایک نئی جہت پیدا کر دی ہے ۔ ان کا مشاہدہ اور ان کی فکر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں کیونکہ دونوں اُم الکتاب" یعنی زندگی کا عطیہ ہیں۔

نازش کی غم دوستی کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں نازش کی شاعری کے ضمن میں سب سے پہلے اس اشارہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کہ غم کوئی روگ یا بیماری نہیں ہے نہ یہ خلوت اور بے نیازی کا نتیجہ ہے اس کا بے حسی سے بھی کوئی علاقہ نہیں ناز ش کے غم میں المیہ کی شان ہے اُن کے المیہ اشعار ہم پر اس دُہری حقیقت کو آشکار کرتے ہیں کہ انسان کتنا بڑا ہے اور کتنا چھوٹا ہے ــــ ایک طرف تو وہ اتنا بڑا کہ غم دوراں اسکی زندگی میں یوں سما جاتا ہے جیسے نیلا پھیلا ہوا آسمان ہماری آنکھوں کے تل میں، اور چھوٹا اتنا کہ غم دوراں کی قبا کو اپنا ملبوس بنانے والا اپنے کرب کے گرداب کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔ بہر صورت ناز ش حوصلے کے ساتھ غم کے مقابل صف آرا رہیں۔ ان کی ذات ایک رزم گاہ ہے جس میں غم دوراں کے لشکر ہیں اور ان کی ذات کا ثبات ــــ آیئے اس غم دوستی کے مختلف مرحلے اور منظر ان کے اشعار کی صورت میں دیکھتے چلیں ؎

دامن پہ پڑے گردِ مسرت تو جھٹک دیں
ملبوس ہمارا غمِ دوراں کی قبا ہے

میں اپنے کرب کے گرداب کا اسیر رہا
زمانہ تیرتے لمحات کی ترنگ میں تھا

لا کے ماتھے پہ شکن وقت سے سمجھوتہ کیا
غم کی تاریخ کے ہم اتنے گنہ گار ہوئے

گھولا گیا ہے زہر سرِ چشمۂ حیات
اب کوئی خضر تشنۂ آبِ بقا نہ ہو

ساکت کھڑا ہوں تیرگیٔ جبر و کرب میں
میری خودی کا چاند ہی گہنا گیا نہ ہو

کام آ سکی نہ ایک بھی دیوار ضبط کی
گذرا جو دل کو توڑ کے دریا ملال کا

خالی خالی سا نظر آتا ہے بازارِ افق
رات بھر جیسے خریدارِ سحر آتے رہے

ان اشعار میں ذاتی غم غمِ دوراں اور غمِ حیات ۔ سب کا جلوہ نظر آتا ہے نازش کو ملال کے دریا کے ہاتھوں اپنے دل کی شکست کے احساس کے ساتھ چشمۂ حیات کی زہر آلودگی سے آگاہی بھی ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ بقا محض ایک علامت اور ایک خواب ہے ۔ ایک ایسا خواب جو انسان کا مقدر نہیں بن سکتا مگر اس آگاہی کے باوجود وہ غموں کے مقابل چٹان صفت کھڑے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شخصیت کی چٹان غموں کے آبشار کے تند و تیز دھاروں میں ڈوب گئی ہے ؎

خودی شناس غمِ روزگار میں ڈوبے
چٹان جیسے کسی آبشار میں ڈوبے

نازش کی المیہ شاعری میں ان کی شخصی سالمیت بے نقاب ہو کر ابھری ہے۔ غم اور حوادث کے مقابل اپنی صف آرائی کا اعلان کرنے والے غزل گو ہمارے عہد میں کئی ہیں اس گروہ کے سرکردہ یگانہ یاس چنگیزی ہیں یگانہ کا مردانہ آہنگ غیور لہجہ اور چنگیزی تیور مجھے بہت عزیز ہیں ، مگر ان کے لہجے میں ہر جگہ وہ اعتدال نہیں ہیں جو گرم و سردِ زمانہ کے سمونے سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے سہارے آدمی بڑی بات بھی سرسری لہجے میں کہہ جاتا ہے یگانہ کے ہاں کہیں کہیں یہ خصوصیت ملتی ہے اور ان کے ایسے شعر ہمارے شعری ادب میں اپنی مثال نہیں رکھتے ؎

نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

نازش کے ہاں یہ لہجہ ایک مستقل خصوصیت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے کردار اپنے

استوار مزاج کا اعلان اعتدال کے لہجے میں کرتے ہیں میں نے ابھی ان کے جو پانچ چھ شعر آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں وہ اس دعوے کی دلیل ہیں بالخصوص یہ شعر ؎

لا کے ماتھے پہ شکن وقت سے سمجھوتہ کیا
غم کی تاریخ کے ہم اتنے گنہ گار ہوئے

نازش ماتھے کی شکن کو اپنی گنہگاری قرار دیتے ہیں، اور حوادث اُن کے نزدیک ان کی تحریک تبسم پر وقت کے وار ہیں جس آدمی کا یہ لہجہ ہوگا اس کا غم یا غم پسندی روگ نہیں ہو سکتی نازش کا غم ذاتی بھی اور کائناتی بھی اس غم کو کئی عناصر نے مل کر تعمیر کیا ہے یہ غم صرف اپنے خوابوں کی شکست سے عبارت نہیں ہے اس میں غمِ دوراں اپنی ان گنت سطحوں اور تہوں کے ساتھ موجود ہے ؎

دامن پہ پڑے گردِ مسرت تو جھٹک دیں
ملبوس ہمارا غمِ دوراں کی قبا ہے

اس غم کی اساس انسانی مقدر اور اس کا عرفان ہے یہ تیرگی جبر و کرب کی روئیداد ہے اور اس تیرگی نے نازش کو اتنا ہشیار اور بیدار بنا دیا ہے کہ وہ کسی فریبِ نظر کا شکار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ وہ وہاں بھی چراغ جلانا چاہتا ہے۔ جہاں اجالا ہے اس مرحلے تک اردو کا کون جدید شاعر پہنچا ہے؟

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اجالا ہے

گذشتہ چار پانچ سال میں نازش کی شاعری میں اجتماعی اور سیاسی غم بھی ابھر آیا ہے۔ اس سے پہلے سیاسی اور اجتماعی مسائل اُس کے غمِ کائنات کا ایک پرتو تھے اب یہ رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے اس کا سبب حالات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اب وہ سیاست کے حوالے سے اپنے ماحول اور زندگی کو دیکھنے لگا ہے ؎

ملے ہیں آنکھوں کو آنسو، دلوں کو سکتہ زخم
تمہارے دور میں کتنی بڑی کمائی ہوئی

دہک رہا ہے کنارہ کہ آگ کی ہے لکیر
وہ لُو چلی ہے کہ سوکھی سمندروں کی زباں

ہر ایک گھر میں بپا روشنی کا ماتم ہے!
چراغ کتنے بجھائے ہوا کو ہوش کہاں

لیکن یہ سارے غم مل کر بھی اس نئے شاعر کی ذات کی سالمیت کو ریزہ ریزہ نہیں کر سکے ہیں۔ ہر غم ایک زمانہ ہے اور زندگی اُن ہی زمانوں کی ایک مسلسل زنجیر ہے ۔ شاعر آج بھی سالم کھڑا ہے اور اپنی جگہ کوہ ندا ہے جس سے یہ آواز ہم رہروانِ زیست تک پہنچ رہی ہے ؎

ہم جن کی دستبرد سے زندہ نکل گئے!
اے زیست دفن ہیں وہ زمانے کہاں کہاں

شاعر کی ذات میں اس سالمیت اور امید کا بڑا دخل ہے۔ بہتر زمانوں کی امید جو ہمیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے ۔ انسان کی فطرت پر امید جو ہمیں انسانوں کی کمینگی کے تجربوں کے باوصف انسان کے بنیادی جوہر سے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ امید جو اندھیروں میں اُجالوں کے خواب دیکھتی ہے امید جو بچوں کی مسکان کو انسانیت کے باغ میں ایک نئے پھول کی "مسکان" سمجھتی ہے امید زندگی کا وہ دریچہ ہے جو دریا کی طرف کھلتا ہے ؎

اگر امید کو چھوڑا تو ہر طرف ہے سراب
کہ اس دریچے سے دریا نظر بھی آتا ہے

میرے علم کی حد تک امید کے باب میں یہ اظہار ہماری شاعری بلکہ ادب میں
بالکل نیا اور اچھوتا ہے ___ امید کو ایسے حسّی منظر میں بدلنے والا شاعر ناؔزش
جیسا ہی آدمی ہو سکتا ہے جس نے فطرت کے رنگ بدلتے مناظر کے رنگوں کو اپنی ذات،
حافظے اور ذہن کی دنیاؤں میں اتار لیا ہو ___ میں ناؔزش کے مشاہدے اور ان کی شاعری
کے اس پہلو کے بارے میں بھی اشارہ کر چکا ہوں ___ گہرا مشاہدہ مجھے بہت عزیز
ہے ___ اپنے مشاہدوں کو الفاظ یا رنگوں کا پیکر عطا کر کے ایک بڑا فن کار ہمیں
زندگی اور اس کی اشیاء کو ایک نئے طور پہ دیکھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔
مشاہدے کی گہرائی اور "جزئیات صفتی" کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیشہ میرؔ کا
یہ شعر مجھے یاد آتا ہے ؎

پھر نہ دیکھا کچھ بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

ناؔزش کا یہ شعر ہے :۔ ؎

اٹھا تھا شعلہ صفت شوقِ سربلندی میں!
اُبھر کے کتنی لکیروں میں بٹ گیا ہے دھواں

ناؔزش اور میرؔ کے اشعار بالکل مختلف تجربوں کا اظہار ہیں دونوں کا منظر
اور پیش منظر مختلف ہے لیکن شاید دھواں ایک مشترک پیش منظر بن گیا ہے۔
اس اختلاف کے باوجود ناؔزش کا شعر یاد آگیا اب جو تجزیہ کرنے بیٹھا ہوں
کہ ایسا کیوں! تو ذہن یہی جواب دیتا ہے کہ دونوں شعر مشاہدے کی گہرائی
کی دولت بے مثال ہیں ___ اور دونوں شعر محض کسی خارجی منظر کا اظہار نہیں
بلکہ دونوں میں ایک باطنی رَد اور موضوعی تجربہ موجود ہے ___
تھوڑی دیر پہلے ناؔزش صاحب کے ایک شعر کے سلسلہ میں میں نے عرض کیا

تھا کہ اس مرحلے تک اردو کا کون جدید شاعر پہنچا ہے۔ مرحلے سے واضح طور پر میری مراد تجربہ ہے یا منزلِ تجربہ ___ آج کے جدید تر شاعر شاعری کی کئی اصناف میں اپنے ذہن اور جدید تر تجربوں کا اظہار جدید تر اسلوب میں کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے غزل کو ایک نئی سمت عطا کی ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہمارے بعض پرانے شاعر، جدید غزل کے اس دور میں بھی سمت نمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ فیض احمد فیض، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔ نازش حیدری اسی قبیلے کے ایک فرد ہیں اور اسی کارواں کے ایک راہی ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے ایک مضمون میں یہ بات عرض کی ہے کہ :۔

"شاید ہم نسلی خلا (جنریشن گیپ) کے حقیقی معنی کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔ یہ خلا ذہنی خلا ہے جو ایک ہی نسل کے افراد کے درمیان ہو سکتا ہے (غالب اور ذوق) اور یہ بھی ممکن ہے کہ کئی زمانوں کے لوگ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہوں (میر، غالب حالی اقبال) کئی بزرگ ایسے ہیں جو مجھے اپنی ہی نسل کے رکن نہیں بلکہ رہبر معلوم ہوتے ہیں (مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اختر حسین رائے پوری وغیرہ) اور اپنی بعد کی نسل کے کئی افراد میں مجھے اپنی اور اپنی نسل کی فکر کا تسلسل بلکہ ارتقا نظر آتا ہے۔"

(ایک بے عنوان تحریر : مطبوعہ فنون لاہور، نومبر دسمبر ۷۵ء)

نازش حیدری کی غزل میں اگر ایک طرف اردو غزل کی مسلمہ روایات اور اپنے ہمعصروں کے رجحانات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کے لہجے میں جدید تر غزل کے رجحانات اور اسالیب بھی موجود ہیں ___ اگر تسلسل نہ ہو تو ایک عہد کا ادب آنے والے عہد میں کیوں بڑھ جائے ___ نازش حیدری اپنی توانائی کے سہارے کتنے ہی زمانوں کی دست برد سے زندہ بچ نکلے ہیں اور آج اس لہجے میں غزل سرا ہیں ؎

شکستِ شوق کا احساس انگ انگ میں تھا
اک آئینے کی طرح میں دیارِ سنگ میں تھا
میں اپنے کرب کے گرداب کا اسیر رہا!
زمانہ تیرتے لمحات کی ترنگ میں تھا

خالی خالی سا نظر آتا ہے بازارِ اُفق
رات بھر جیسے خریدارِ سحر آتے رہے

خردِ آئینہ تھی آبِ رواں تھی
اب اس پر کائیوں کی تہ جمی ہے

کوئی بھی ترے شہر میں غم خوار نہیں ہے
اشجار تو ہیں سایۂ اشجار نہیں ہے!

صحرا صحرا خاک اڑا کر حسنِ سخن کو غازہ دیا
بستی بستی شعر کے پرچم نازش نے لہرائے بہت

سَو بار دھواں پھول کے سینے سے اٹھا ہے
بادل کے قدم باغ میں اک بار نہ ٹھہرے

پگھلیں گے غموں کی دھوپ کھا کر
احساس کے منجمد ذخیرے

اس فن کے ساتھ نازش، ناصر کاظمی کے عہد کے بعد کے غزل سراؤں کی محفل میں بھی آپ کو تنہا نظر نہیں آئے گا وہ تو تسلیم احمد، ظفر اقبال اور تنویر اور خالد احمد اور ثروت حسین کی بزمِ غزل میں بھی ایک شناسا اور شناسا آواز کی طرح سُنا جائیگا یہ بات ابھی ابھی عرض کی ہے کہ یہ بات نازش حیدری تک محدود نہیں بلکہ کئی اور پرانے شاعر بھی اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور اس حقیقت کے پیشِ نظر میں جدید

غزل کے مطالعے کو بھی جدید تر ناموں تک محدود رکھنے کا قائل نہیں۔

بات تجربے کی ہو رہی تھی اور وہاں سے گزر کر اسلوب تک جا پہنچی ــــ بات کا یہ گریز اور پھیلاؤ منطقی ہے کیونکہ شعر نام ہے تجربے کے الفاظ میں ڈھلنے کا اور الفاظ میں ڈھلنے کے پیرائے کو ہم اسلوب کہتے ہیں۔ یہ اسلوب شاعر کی ذات کا پرتو ہے

نازش نے اسلوب پر فتح کے ذریعے بعض ایسے تجربات کو نہایت نئے انداز میں پیش کر دیا ہے جو ہم سب کے تجربات ہیں تنہائی کا احساس ہمارے عہد کا سب سے عام المیہ ہے، ہم مجمعوں میں تنہا رہنے والے لوگ ــ ہم وہ ہیں جنہیں ــــــــ LONELY CROWD کہا گیا ہے ــ اور اس معاشرے میں فن کار ہمارے خلوص اور پیار کا سرمایہ لے کر جب یگانگت کی تلاش میں

ہے تو مغائرت کے خرابے میں جا بھٹکتا ہے ــ نازش کا شعر سنیئے ؎

لئے چراغِ شناسائی میں جدھر بھی گیا
مغائرت کے دیارِ عظیم تک پہنچا

یہ ہمارے عام تجربے کا کتنا الگ اور مختلف اظہار ہے، حالانکہ عام تجربوں کا اظہار شاعر کو ذوقی کی طرح "پنچایتی شاعر" بنا دیتا ہے۔

نازش کے اسلوب کی انفرادیت کا اندازہ اُن کے کلام پر نظر ڈالتے ہی ہو جاتا ہے ــــ نئی ترکیبوں اور اظہار کے پیرایوں کی ان کے ہاں کمی نہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ہم استعاروں کو مدت سے نئی ترکیبیں کہہ رہے ہیں۔ اچھا شاعر دو یا زیادہ لفظوں کو فارسی (یا اردو) کے مطابق نہیں جوڑ دیتا وہ تو دو مختلف تجربوں کو دو یا زائد لفظوں کے آمیزہ سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور اس کا تخئیل، مشاہدہ اور فن ان کے درمیان تشبیہ کا تعلق قائم کر دیتا ہے۔

میں نے جو شعر اب تک مثال میں پیش کئے ہیں ان میں استعارے کی کئی مثالیں مل

جائیں گی دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

حُسن کی دھوپ اور چمکی ہے

دیکھ کر سایۂ نظر میرا

جلوے آنے لگے سلامی کو

کھُل گیا ہر جہِم نظر میرا

نازش حیدری کے اسلوب کا ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جدید شعرائے غزل کی طرح کئی ایسے الفاظ کو غزل کا حصہ بنا دیا جو غزل کے دائرے سے باہر سمجھے جاتے تھے مثلاً "ذخیرے" کا لفظ ـــــ اور یہ کچھ انہوں نے چونکانے کی خاطر نہیں کیا ـــــ یہ لفظ ہی ان کے اس تجربے کا بوجھ اٹھا سکتا تھا کہ

پگھلیں گے غموں کی دھوپ کھا کر

احساس کے منجمد ذخیرے

نازش کے مجموعے کے مطالعہ سے آپ اُن کے تفکر تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ آج کے کم غزل گو شعراء کے کلام کا فکری پہلو اتنا قابل توجہ ہے ـــــ میں فکرِ مجرد کو شاعری کے لئے لازم نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ انسان ذہن اور ل کا مجموعہ ہے اسی لئے اس کی بہترین تخلیقاتِ فنی ہیں۔ جذبہ اور فکر کا امتزاج روری ہے ـ شاعر کا امتحان یہیں ختم نہیں ہو جاتا ـــــ اس سے ہم یہ مطالبہ بھی رتے ہیں کہ وہ فکر کو جذبہ کا رنگ و آہنگ عطا کر دے نازش کی غزل اس مطالبے سے پوری طرح عہدہ برآ ہوتی ہے ؎

آنکھوں میں سمٹ آئی ہر دور کی بینائی
ب شورش بے پایاں تاریخ نے دہرائی

جو لوگ نشہ سے ابھرے خمار میں ڈوبے
ایک سطح پہ دیکھی گئی ہے گہرائی

سقراط خود ہی زہر کا خواہاں ہے آجکل
ں دورِ ناشناس کی رفتار تیز ہے

رمیں سوچتا ہوں کہ اپنے تمام حسن، اپنے تمام رنگوں کے ساتھ نازش کی غزل بھی اسکی زندگی ے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ ہی تو ہے۔

کچھ اپنے متعلق

نام اور تخلص : محمد خورشید حسن نازش (حیدری)

وطن اور تاریخِ ولادت : دہلی ۔ یکم جنوری ۱۹۱۴ء بروز عید الفطر (پیر) بوقت اذانِ فجر ۔

تعلیم : انٹر ۔ منشی فاضل

اساتذۂ گرامی : (۱) جانشین مرزا داغ حضرتِ بیخود دہلوی (۲) تلمیذ حضرت غالب ، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی (۳) خیام الہند سیّد جلال الدین حیدر دہلوی ۔

میں نے شعرائے قدیم کے دور میں آنکھ کھولی اور جدید دور تک پہنچ گیا ۔ میرے کلام میں دونوں رنگوں کا امتزاج ملے گا ۔ تاہم نئے اسلوب و مضامین اور نئی تراکیب کے عنصر کی زیادہ جھلک ملے گی ۔ پنڈت ساحر نے میری اردو کی متعدد غزلیں دیکھنے کے بعد فارسی میں شعر گوئی کی تلقین کی پھر بھی ایک طویل مدت تک فارسی کے ساتھ اردو غزلوں پر اصلاح لیتا رہا ۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان میں بآسانی شعر کہہ لیتا ہوں ۔ عراق اور ہندوستان میں چند نظمیں ، انگریزی میں بھی کہیں ۔ میرے کلام کا بیشتر حصہ نئے وطن میں آتے وقت دہلی میں رہ گیا دوسری جنگِ عظیم میں عراق میں کئی جگہ کام کرنے کے بعد سنسر آفیسر مقرر کیا گیا ایران اور فلسطین میں بھی مختصر عرصے قیام کیا ۔ جبل پور اور چاندہ (سی ۔ پی ہندوستان میں علی الترتیب راشننگ آفیسر اور داروغۂ جنگلات کے عہدوں پر کام کرتا رہا ۔

۱۹۴۸ء میں الہ آباد میں سی پی برار کے لئے اردو پرائمری نصاب لکھا جو تقریباً ۴۲ سال کے بعد تک پڑھایا جاتا تھا ممکن ہے اب بھی مروّج ہو۔ دہلی اور کراچی میں علم العروض پر دو مختصر رسالے تعلیم شاعری اور رہنمائے شاعری طبع ہوئے۔ کراچی میں ۱۳ کتابیں بچوں کی کہانیوں پر مشتمل طبع ہوئیں۔ کراچی یونیورسٹی اور کالج کی مختلف کتابوں اور دو تین انگریزی ناولوں کے ترجمے کئے۔

میرے جدِّ امجد مولوی محبوب علی شاہ اصغری ایک درویش کامل اور فارسی اُردو شاعری کے استاد تھے۔ مریدوں کی بھی تعداد بہت تھی وہ شاہ کلیم اللہ رح جہاں آبادی کے سلسلے میں تیسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے اردو زبان میں سب سے پہلے ایک کتاب علم الرمل پر لکھی۔ یہ کتاب محبوب الرمل اب بھی لاہور اور لکھنؤ میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ والد بزرگوار مرحوم جناب محمود علی انوری اُردو اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ہم چار بھائیوں میں سے تین کو شاعری سے شغف تھا انور دہلوی کراچی میں موجود ہیں۔ برادر بزرگ مزاح گو تھے۔ جناب فتنہ دہلوی یہیں تقریباً دو سال قبل خدا کو پیارے ہو گئے۔ میری ایک بڑی ہمشیرہ جو پنجاب میں ہیں اور "ص" تخلص کرتی ہیں نعت گو ہیں۔

میں تغزل کے موضوع پر نکھری ہوئی شعریت، تخیل کی گہرائی اور جدید اسلوبِ فکر کا معتقد ہوں جس میں الفاظ کا استعمال برجستہ ہو اور بے ساختگی سے استعمال کئے گئے ہوں۔ میں لفظی ہیر پھیر کا قائل نہیں ہوں۔ تاہم میری تخلیقی توانائی میرے ساتھ ہے اور ہمعصر شعراء کی ان کے ساتھ۔ فکری عمق اور اندازِ نگارش کسی ایک کی میراث نہیں ہے۔ مجھے حضرتِ حیدر دہلوی کا جانشین ان کے تلامذۂ برِّصغیر نے متفقہ طور پر منتخب کر کے ذمّہ داری سونپ دی ہے۔ میرے تلامذہ کی تعداد میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی تعداد زیادہ

نہیں ہے۔ فارغ الاصلاح شاگردوں میں سلام سالگری (ہند) دانش جالندھری (عراق) اقبال ساجد (لاہور) اور کراچی کے خاور نظامی نیز اقبال عالم ہیں اس کے علاوہ کافی مشق رکھنے والے دیگر شاگرد یہ ہیں نظر لکھنوی۔ اسلم مونگیری حمید اختر ناگپوری۔ طاہر شجاع آبادی، نقش ہاشمی (پنجاب) ظفر محمد خاں ظفر ٹونکی (سینیئر سائنٹفک آفیسر محکمۂ تحقیقاتِ خلا و بالائی فضا پاکستان) انجم اکبرآبادی۔ پروفیسر سرور اکبرآبادی۔ محمد احمد کمال شاہ جہاں پوری۔ ذاکر حسین ذاکر ایڈوکیٹ۔ فصاحت وارثی وقار بہزاد۔ مختار عزم بہزاد۔ وفا یوسف پوری وفا علی گڑھی۔ نیز بیگم حسن زمانی عالمگیر۔ نور بانو محجوب خانم علی گڑھی۔ روشن زریں۔ نگہت بیگم ایم اے شاہین بیگم ایم اے دہلوی وغیرہ،

میرے قدیم دوست میری شاعری سے کچھ بھی تاثر لیں میں ؎

" تمتع ز ہر گوشۂ یافتم — زِ ہر خرمنے خوشۂ یافتم " (سعدی)

پر عمل پیرا ہوں۔

میرے ایک قدیم اور مخلص دوست نے کسی رسالے میں میرے استاد حضرتِ حیدر دہلوی کو پنڈت ساحر آنجہانی کا شاگرد بتایا ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کیونکہ میں سالہا سال سے جناب اثیر دہلوی (مقیم کراچی) اور طالب دہلوی کے ساتھ ان سے دونوں زبانوں میں اصلاح لیتا رہا ہوں اور ۱۹۴۲ء میں ان سے جدا ہوا اس زمانے میں صرف فارسی کلام پر ان سے اصلاح لیتا تھا اور خیام الہند حضرتِ حیدر دہلوی نے اردو شاعری میں ۱۹۴۰ء میں فارغ الاصلاح کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "صبح الہام" اور "رباعیاتِ حیدر" میں کہیں پنڈت جی کا ذکر نہیں کیا۔ جب کہ میں پنڈت جی سے عقیدت کے متعلق مشاعروں میں رباعیاں پڑھا کرتا تھا۔ پنڈت جی غالب کے علاوہ ان کے ایرانی دوست

عاصم کاشانی سے بھی فارسی میں اصلاح لیتے رہے ہیں ۔ میں آج تک طالب علم ہوں اور گلستانِ ادب سے گل چینی کی تشنگی نہیں جاتی ۔

میں آخر میں اپنے بزرگوار پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری اور رئیس شعبہ اردو جامعہ کراچی حضرت ابوالخیر کشفی کا دل و جان سے احسان مند اور شکرگزار ہوں ۔ ان دونوں قابلِ احترام شخصیتوں نے ایک ذرۂ ناچیز کو آفتاب کے قریب پہنچا کر حوصلہ افزائی فرمائی اور ارتقائی منزلوں کے باب مجھ پر کھول دئے ۔

میری ایک بڑی ضخیم بیاض دہلی میں ۱۹۴۷ء میں رہ گئی جس کی کچھ غزلیں اخبار ملاپ اور ماہنامہ پرتاپ اور ماہنامہ "بیسویں صدی" میں نانک چند گاندھی کے نام سے شائع ہوئی ہیں
اور کچھ دن بعد ان میں حقیقتِ حال شائع ہوئی کہ یہ کلام نازش حیدری دہلوی کا ہے اس گمشدہ بیاض میں عراق میں لکھی ہوئی چند مختصر انگریزی نظمیں بھی تھیں ۔ ایک پنجابی کی غزل تین چار فارسی غزلیں ۔ نیز ابو سعید ابوالخیرؒ کی فارسی رباعیات کا کچھ ترجمہ اردو رباعیات میں درج تھا جو جامعہ ملیہ دہلی کے لئے شروع کیا گیا تھا ۔

(نازش حیدری عفی عنہٗ جانشینِ خیام الہند حضرت حیدر دہلوی مرحوم و مغفور)
(صدر مرکزِ شعور و ادب ۔ حیدر آباد ۔ کراچی)

مولانا صلاح الدین سے قبل یہ مجموعہ ایک اور کتابت خانے کو دیا گیا لیکن کافی تعداد میں غزلیں اور نظمیں وہاں سے گم ہو گئیں ۔

نازشؔ حیدری

میں ان حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھ سے مالی ذہنی اور دیگر قسم کا تعاون کیا ہے ان میں جناب اسلم مونگیری ، جناب نظر لکھنوی ، پروفیسر سرور اکبر آبادی ، مولانا فصاحت وارثی میرٹھی ، جناب عبداللطیف مذاق رامپوری ، ڈاکٹر سلیمان پاشا ، جناب وفا علی گڑھی ، خاور نظامی ، جناب بیگ صاحب (جامعہ کراچی) اور مہر النساء مہر لکھنوی (امریکہ) ، اور برادرم منظور اشعر وغیرہ ۔

حمد

اک مظہرِ حقیقت ٹھہرا پیام تیرا
باطل کی قوّتوں پر بھاری ہے نام تیرا

تیرا چراغِ قرآں رکھا ہے طاقِ دل پر
سینوں کی جگمگاہٹ حسنِ کلام تیرا

تو مطلع ازل پر اک آفتابِ روشن
نظروں سے رہ کے پنہاں جلوہ ہے عام تیرا

چھلکے ہوئے چمن میں ہر سُو ہیں رنگ و نکہت
ہر دستِ شاخ میں ہے تابندہ جام تیرا

ممکن نہیں کہ کر لے تخئیل بھی احاطہ
ادراک کی حدوں سے اونچا ہے بام تیرا

نازش کو ہر روش پر تیری جھلک ملی ہے
ہر موجۂ صبا میں دیکھا خرام تیرا

نعت

گرا ہیں سجدے میں اپنی ہی گردِ پا کی طرح
نگاہ میں کوئی سایہ نہ تھا مصطفےٰؐ کی طرح

چراغ راہ بری ہے اندھیری راہوں میں
ہمارا دل ہے محمدؐ کے نقشِ پا کی طرح

حضورؐ صفحۂ کونین پر ہیں لفظِ بلیغ
میں لوحِ دہر پہ اک حرف ناسزا کی طرح

نبیؐ کا غم بھی بڑا قیمتی خزانہ ہے
ہر اشک آنکھ میں آتا ہے کیمیا کی طرح

یہ زندہ معجزہ جینے کا فن سکھاتا ہے
کہ آج اُن کی خموشی بھی ہے نوا کی طرح

ہمارے دَور کو بھی ہے طلب اُجالے کی
اُتر بھی آئیے خالی ہے دل حرا کی طرح

نبیؐ کی دید ہے آنکھوں کی التجا نازشؔ
زباں خموش ہے آنسو ہیں التجا کی طرح

نعت

ادب وصفِ نبیؐ میں رہنما ہے
میں چپ ہوں اور مرا دل بولتا ہے

خدارا بھیک نظارے کی دیجے
کہ دامانِ نظر پھیلا ہوا ہے

اُٹھی وہ چشمِ بخشش تو یہ دیکھا
گناہوں کا جنازہ اٹھ رہا ہے

اُجالوں کے عدو ہیں سائے لیکن
تمہارا سایہ سورج بن گیا ہے

قدم وقتِ رواں آہستہ رکھئے
مدینہ خوابگاہِ مصطفٰےؐ ہے

تمہارے سبز گنبد کے کلس پر
توازن وسعتِ کونین کا ہے

مدینے کی طرف جاتے ہیں نازشؔ
غمِ دوراں ہماری گردِ پا ہے

غم تو ساتھ آ گئے ہر خوشی رہ گئی   مجھ سے پیچھے بہت زندگی رہ گئی

ہر چراغِ طرب ہم نے روشن کیا   غم کی کھڑکی مگر ادھ کھلی رہ گئی

اپنی میّت لئے جا رہا ہوں کہیں   دفن ہو کر کہاں زندگی رہ گئی

خود کو دیکھیں کہ تم پر کریں صَرف ہم   اب ہماری نظر آخری رہ گئی

جان نکلی اک ارمان کو چھوڑ کر   شمع گھر میں دھری کی دھری رہ گئی

اس قدر جلد راہِ سفر طے ہوئی   میری عمرِ رواں سوچتی رہ گئی

نازشؔ اُبھرا نہیں سورج اُن کے بغیر

صبح کی روشنی میں کمی رہ گئی !

یہ خاکداں ہی نہیں زیرِ کاشتِ تخمِ گناہ

فضائے خُلد میں بھی اعتبارِ گندم تھا

سلامتی سے سفینہ مرا رہا نازشؔ

زمینِ شعر و سخن پر بڑا تلاطم تھا

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے

وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اجالا ہے

ترے سکوں کے تصدّق تری خوشی پہ نثار

وہ زندگی کہ جسے حادثوں میں پالا ہے

طلسمِ تیرہ شبی کا حصار ٹوٹے گا

اک آفتاب ابھی مسکرانے والا ہے

نجوم سمٹے ہیں ترتیبِ کہکشاں کے لئے

تمہارے ناز نے آنچل جہاں اچھالا ہے

افق پہ دیکھ رہا ہوں جو روشنی کی لکیر
چراغِ صبح کا یہ آخری سنبھالا ہے

نظامِ نَو کا جو چہرہ اتر گیا نازشؔ

لہو غریب کا رنگت بدلنے والا ہے

دے کر نشاط، غم کی حیاتِ دوام لوں

صبحیں تری ہزار ہوں میں ایک شام لوں

اے دِل ابھی نہ ڈوب، ابھی اور غم بھی ہیں

سورج رُکے تو آخری تصویرِ شام لوں

سایہ پکارتا ہے کہ پھیلاؤں روشنی

دیوار کہہ رہی ہے کہ گرتوں کو تھام لوں

کیا فیصلہ کروں کہ مؤدّب ہیں دو جہاں

غم کا سلام لوں کہ خوشی کا سلام لوں

اس سوچ میں گزرتی چلی جا رہی ہے عُمر

سمجھوتہ غم سے کر لوں کہ ساقی سے جام لوں

نازش مجھے بھی جس نے جدُا مجھ سے کر دیا

بے نام ایک شخص ہے کیا اس کا نام لوں

مجھ کو بد نام کر گئے آنسو
اپنی حد سے گزر گئے آنسو

دل سے اٹھے تھے یاس کے بادل
سرِ دامن بکھر گئے آنسو

آئینہ ہو گئے مرے جذبات
روتے روتے نکھر گئے آنسو

مسکراہٹ کی تلخیاں نہ گئیں
سطحِ غم سے ابھر گئے آنسو

جگمگائی ہیں کتنی تصویریں
کتنے خاکوں میں بھر گئے آنسو

تھا یہ وقت اُن کے خیر مقدم کا
اب کہاں جل کے مر گئے، آنسو

میری آنکھوں سے پوچھیے نازشؔ
رُک گئے کس کے نام پر آنسو

تیرے شہر سے رونق مانگی بن سے جب اکتائے بہت
گو نخ اٹھا دل کا سناٹا آرزوئیں ہم لائے بہت

کیوں نہ حوادث سے ٹکرائیں، کیوں منزل کو جلد نہ لیں
حوصلہ یا تحقیق بہت ہے فکر بہت یارائے بہت

عنوانوں پر بحث تھی جاری تیرا افسانہ کہہ نہ سکے
سب کی آوازوں کے ٹکڑے آپس میں ٹکرائے بہت

کتنی چٹانیں ریت بنی ہیں موجیں کیوں معذور نہ ہوں
ساحل ساحل پیاس بڑھی ہے دریا تو لہرائے بہت

فصلِ گل کی راہگزر میں حادثہ خود ہی مول لیا
ہم نے وہیں دل اپنا رکھا پھول جہاں مرجھائے بہت

آس کی چلتی پھرتی شمعیں حدِّ نظر تک رقصاں تھیں
یاس نے لیکن دکھ کے پتھر راہوں میں پھیلائے بہت

صحرا صحرا خاک اُڑا کر حسنِ سخن کو غازہ دیا
بستی بستی شعر کے پرچم نازش نے لہرائے بہت

رہیئے کچھ روز خوش جمالوں میں
جان پڑ جائے گی خیالوں میں

دل میں ٹھہری تری نظر جب تک
غم نہاتے رہے اجالوں میں

ہے دلوں میں تمہاری موجِ نگاہ
رقص کرتی ہے مئے پیالوں میں

بے تکلّف ہیں کچھ مرے احباب
غم بھی ہے آنے جانے والوں میں

زخمِ دل کی بہار کم نہ ہوئی
پھول لائے گئے مثالوں میں

ایک نازک سا ہاتھ شامل ہے
مجھ پہ پتھّر اٹھانے والوں میں

ہے یہ رفتارِ ارتقا نازش
چاند ہے اپنے پائمالوں میں

یوں ہوا راہِ طلب میں مرا اِقدام کہ بس
اس طرح رہ گئے پیچھے سحر و شام کہ بس

شعلے، گُل بن کے گلستاں میں بلاتے ہیں مجھے
شوق کہتا ہے کہ چل، ضبط کا پیغام کہ بس

ہونٹ کُھل جاتے ہیں کِھلتے ہوئے غنچے کی طرح
ایسے بے ساختہ آتا ہے ترا نام کہ بس

یوں بھی تنہائی میں آتا ہے کوئی یاد کہ واہ
یوں بھی آتی ہے مہکتی ہوئی اِک شام کہ بس

کون ہوتا ہے خریدارِ مسرّت نازشؔ
ہو گئے اس قدر ارزاں غم و آلام کہ بس

سراسر اُن کو گلستانِ آرزو کہیئے

رُکیں تو رنگ سمجھئے، چلیں تو بُو کہیئے
ہماری تشنگیٔ شوق کی ہے بات کچھ اور

یہ وہ نہیں جسے دورانِ گفتگو کہیئے

مجھے شکست کا الزام بھی قبول مگر

مقابل آیئے، برباد جستجو کہیئے

سوالِ شوق کا اکثر جواب بنتی ہے

تری نظر کی خموشی کہ گفتگو کہیئے

ہماری تشنہ لبی کو نہ کر سکی سیراب

وہ گفتگو کی روانی کہ آب جو کہیئے

ہر انقلاب کی لہر اپنے میکدے میں ہے

کسے شراب سمجھئے، کسے لہو کہیئے

چمن بدوش ہے ہر وادئ نظر نازش

میری حیات کو کشمیر آرزو کہیئے

تم جس جگہ رکے ہو کرنیں بکھر گئی ہیں

راتوں سے دور ہوکر صبحیں ٹھہر گئی ہیں

تیرے جمال سے ہے یہ حال بے خودی میں

ہم آگے بڑھ گئے ہیں نظریں ٹھہر گئی ہیں

نظروں میں تیرتی ہیں پرچھائیاں جہاں کی

آنکھوں میں عمر بھر کی نیندیں ٹھہر گئی ہیں

گزرا وہ زندگی سے کس پیار میں تڑپ کر

جس کے گلے میں غم کی باہنیں ٹھہر گئی ہیں

شکوہ تھا ہم کو تم سے بے اعتنائیوں کا

لیکن وہ اس جہاں کی رسمیں ٹھہر گئی ہیں

ارباب حُسن کی آہ اللہ رے لطافت

اجسام سے نکل کر روحیں ٹھہر گئی ہیں

محسوس ہو رہا ہے طوفان میں پہنچ کر

ہے رقص میں کنارہ لہریں ٹھہر گئی ہیں

نازش ہیں نقش دل پر رعنائیاں کسی کی

کاغذ پہ جیسے آکر غزلیں ٹھہر گئی ہیں

★

ترتیب پا رہے ہیں فسانے کہاں کہاں

کھینچے خطوط لغزشِ پا نے کہاں کہاں

ہم جن کی دستبرد سے زندہ نکل گئے

اے زیست دفن ہیں وہ زمانے کہاں کہاں

حالات مجھ کو شکل دکھانے کے واسطے

آئینہ لیکے پہنچے ہیں جانے کہاں کہاں

تسکین مانگتی رہی شعلوں سے بھی حیات

دریا گیا ہے پیاس بجھانے کہاں کہاں

نقشِ قدم کی طرح رہوں، کیوں نہ راہ میں

ڈھونڈیں گے آنے والے زمانے کہاں کہاں

دستِ مژہ میں اشک تھے نازش تمام عمر

پہنچے ہیں ہم ستارے اُگانے کہاں کہاں

○
○
○

یادِ ماضی مرے احساس کو آباد نہ کر

میرے بھولے ہوئے ساتھی مجھے اب یاد نہ کر

میں اک کشاکشِ امید و بیم تک پہنچا

کبھی تپش، کبھی موجِ نسیم تک پہنچا

ہر ایک گام پہ تحقیق چاہتی تھی خرد

بھٹک گیا تو رہِ مستقیم تک پہنچا

مری نگاہ نے دل میں ترے اتار دیا

وہ لفظ جو نہ زبانِ کلیم تک پہنچا

تمہاری یاد نے ماضی کا روپ دُہرایا

یہ سازِ نو بھی نوائے قدیم تک پہنچا

لئے چراغِ شناسائی میں جدھر بھی گیا

مغائرت کے دیارِ عظیم تک پہنچا

پیام بن کے مری زندگی کی جانب سے

نفس نفس مرے دل کے مقیم تک پہنچا

خوشی وہ لفظ کہ گزرا جو معنویت سے

تو میرے غم کی کتابِ ضخیم تک پہنچا

مرے شعور میں شایل رہا طلب کا جنوں

میں شہرِ گل میں جو پہنچا شمیم تک پہنچا

جو برقرار سلامت روی رہی نازشؔ

کوئی حریف نہ طبعِ سلیم تک پہنچا

○

خشک پتّے دمِ پرواز صدا دیتے ہیں

پوری تاریخ بہاروں کی سنا دیتے ہیں

یہ نہ پوچھو ہیں امیدوں کے سفینے کتنے

ہم کنارے سے کنارے کو ملا دیتے ہیں

عارضی طور پر دہ ہم کو اُجالا دے کر
صبح میں شام کا پیوند لگا دیتے ہیں

اس قدر ظرف تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کے جینے کی دعا دیتے ہیں

ان امیدوں سے تو کچھ بھی نہیں حاصل نازشؔ
سایہ دیتے ہیں یہ پتّے نہ ہوا دیتے ہیں

کسے دیکھا تھا یہ تم نے پلٹ کے
ہواؤں نے بہت کھائے ہیں جھٹکے

اُجالے چھُپ گئے کو میں سمٹ کے
اندھیرا سر پٹکتا ہے تو پٹکے

اندھیروں میں کیا ہے خود کو محصور
چراغِ انجمن کی لو نے گھٹ کے

نہ رشتہ دوستوں سے اپنا ٹوٹا
یہ مارِ آستیں ٹھہرے لپٹ کے

توازن کھو دیا آب و ہوا کا
حوادث کی صفیں ہم نے الٹ کے

مری رفتار تھی مقراض شاید
رہا ہر فاصلہ آخر کو بٹ کے

میں تنہا اور تنہا میری جرأت
مقابل حادثے آئیں سمٹ کے

سفر کے فاصلے تھے چلتی آری
ٹھہرتے ہم تو رہتے پاؤں کٹ کے

خلوص اک دھوپ ہے اور وہ بھی نایاب
بہت سائے ہیں کینوں کے لپٹ کے

وہاں بھی تھا تمناؤں کا جھرمٹ
گئے جب گاؤں میں شہروں سے کٹ کے

بلا سے جان ہی جائے گی نازشؔ
اجل سے بھی رہیں گے ہم نمٹ کے

ہم سانس بھی لینے کے سزاوار نہ ٹھہرے
ماضی کے خرابے کی بھی دیوار نہ ٹھہرے

سو بار دھواں پھول کے سینے سے اٹھا ہے
بادل کے قدم باغ میں اک بار نہ ٹھہرے

یوں میری امیدوں کے محل ہو گئے مسمار

جس طرح کوئی ریت کی دیوار نہ ٹھہرے

پہنچا نئے حالات کے دھارے پہ سفینہ

ممکن ہے مرے ہاتھ میں پتوار نہ ٹھہرے

چھینے لئے جاتی ہیں گلستاں کی ہوائیں

ہم برگِ فسردہ کے بھی حقدار نہ ٹھہرے

اے وقتِ رواں ہم ہیں ترے ساتھ ابھی تک

ٹھہریں جو کہیں ہم ترا معیار نہ ٹھہرے

حالات کے چہرے پہ دمکتی رہے سرخی

رِستا ہوا خونِ دلِ فنکار نہ ٹھہرے

اے جلوۂ خاموش ترے شیش محل پر

اک سانس کی دستک بھی کہیں بار نہ ٹھہرے

مسکن مرا اس راہِ حوادث میں ہے نازش

جس جادۂ پُر ہول میں کہسار نہ ٹھہرے

برسیں گے غبار سے بھی ہیرے
اٹھّی وہ نگاہ دھیرے دھیرے

ماضی کی عمیق وادیوں میں
بیدار ہیں خواب کے جزیرے

اے شیشہ گرِ حیات ہشیار!
ٹوٹے ہیں بہت دلوں کے ہیرے

یادوں کے سفینے لا رہے ہیں
اُڑتے ہوئے ابر کے جزیرے

پنہاں ہیں جہانِ رنگ کیا کیا
سینہ تو نظر کا کوئی چیرے

مہتاب کی شمع گل نہ کر دیں
اربابِ شعور کے وطیرے

طوفان میں آس رکھنے والے
ساحل بھی چھپے گا دھیرے دھیرے

پگھلیں گے غموں کی دھوپ کھا کر
احساس کے منجمد ذخیرے

معراجِ نظر ملے گی نازش

کوئی صفِ کہکشاں کو چیرے

جھوٹ کو مصلحت میں چھپاتے رہے

لوگ سچ کے جنازے اٹھاتے رہے

ہم۔ کہ اڑتی ہوئی ریت کی لہر تھے

پتھروں پر لکیریں بناتے رہے

موجِ غم روکنے کا جنوں جب بڑھا

ہم کنارے کو دریا میں ڈھاتے رہے

تھے چمن میں ہم ایسے تباہی طلب

بو کے تنکے جو بجلی اگاتے رہے

وقت کا ساتھ نازشؔ نہ ہم دے سکے

لمحے آواز دے کر بلاتے رہے

تم نے سکوں کی دُنیا لوٹی ! پیڑ سے کیسی کونپل پھوٹی

اُن کی نظر میں دو تصویریں ایک ہے سچی ایک ہے جھوٹی

دل پہ نگاہیں ڈال کے اس نے اپنی محفل خود ہی لوٹی

آنکھ سے اُن کی آنسو ٹپکا کوئی کلی یا شاخ سے ٹوٹی

تیرا دھیان گیا یوں، جیسے ہاتھ سے شمع روشن چھُوٹی

ہر دھڑکن ہے زیست کا ٹکڑا اپنی دنیا ٹوٹی پھوٹی

نازش پودا پیڑ بنا ہے
عشق تھا یا جادو کی بُوٹی

آنکھ سے ان کی آنسو نکلے یا مٹھی سے جگنو نکلے ؟

پھول کھلے تو نکہت کم ہو زخم ہنسے تو خوشبو نکلے

ساتھ اشکوں کے ایک تصوّر جیسے آپ لبِ جُو نکلے

تیرا دھیان آیا یوں جیسے برف کی وادی سے لُو نکلے

کھلتی کلی کو چوم لیا ہے — ہاتھ مرے بے قابو نکلے

ایک میں دنیا ایک میں عقبیٰ — دونوں ہاتھ ترازو نکلے

رنگ اڑائے ہے حسن کا نازش — آپ کے شعر تو جادو نکلے

آ گیا حسن بھی کیا، عشق کی منزل کے قریب

ہر قدم آپ کا پڑتا ہے مرے دل کے قریب

چھوڑ کر میرے سفینے کو کہیں طوفاں میں

موجیں شرما کے رکی جاتی ہیں ساحل کے قریب

اک نظارے ہی میں سب عمر گزر جائے گی

عشق کی آنکھ کھلی ہے تری محفل کے قریب

تھم چکے پائے طلب ہو چکی دل کو تسکیں

ہاں اگر آپ پکاریں مجھے منزل کے قریب

موت کل دے نہ سکیگی مجھے فرصت شاید

آج جی بھر کے تڑپ لوں تری محفل کے قریب

کچھ نہ پانے پہ بھی نازشؔ نے بہت کچھ پایا

آئی آواز کم از کم تری سائل کے قریب

رے اُس نظر کے جھوٹے ہیں — کچھ اندھیرے کرن سے پھوٹے ہیں

ندگی کی نشاط گاہوں میں — کتنے فوّارے خوں کے چھوٹے ہیں

واب کی وادیوں کے کچھ تارے — اشک بنکر مژہ سے ٹوٹے ہیں

ن کمانوں کی مشکلیں توبہ — جن کمانوں سے تیر چھوٹے ہیں

نور کیجیے کہ اشکِ شبنم نے — کس قدر آفتاب لوٹے ہیں،

نم دوراں کے تجربے نازشؔ — گلشنِ دل کے بیل بوٹے ہیں

آؤ اک دن رہِ مقصود پہ چل کر دیکھیں

کِسی دیوار کو گرِ دائیں نہ پتھّر دیکھیں

کتنے خورشید کفِ پا میں حنا بنتے ہیں

اپنے پندار کے زینے سے اتر کر دیکھیں

حوصلہ ہو تو کبھی آنچ نہیں آئے گی ،

غم کے پگھلے ہوئے لاوے سے گزر کر دیکھیں

آنے والے سحر و شام کے رک جائیں قدم

ہم اگر عمر گزشتہ کو پلٹ کر دیکھیں

صِرف سایہ نہیں ہوتا کسی انساں کی دلیل

سطح کو چھوڑ کے آئینے کے اندر دیکھیں

خود کو اِس دور میں محفوظ سمجھنے والے

دستِ گردوں میں دمکتے ہوئے پتھر دیکھیں

یہی راز دونوں جہاں کا ہے یہی شرحِ عشق و جمال ہے

میں الم کا تازہ ثبوت ہوں وہ خوشی کی زندہ مثال ہے

نظران کی خوب سمجھ چکی جو مری وفا کا مآل ہے

وہ مرے ستارہ شناس ہیں جنہیں آنکھ اٹھانا محال ہے

کبھی آنچ آئی نہ آج تک مرے اضطراب کی شان پر

جو تڑپ کے طور پہ رہ گئی وہ تمہاری برقِ جمال ہے

ترے در پہ ختم ہو سلسلہ مرے اجتہادِ نگاہ کا،

تجھے ہر حجاب میں دیکھ لوں یہی انتہائے خیال ہے

غمِ عشق کھلنے کو کھل گیا مگر احتیاط بھی کم نہیں

مرے لب پہ موجِ نشاط ہے مرے رخ پہ گردِ ملال ہے

کئی بار فصلِ بہار نے مجھے ہنس کے دعوتِ دید دی

جو اٹھی تو تیری طرف اٹھی یہ مری نظر کا کمال ہے

جو چمن میں نازشِ بے نوا مرا آشیانہ جلا تو کیا

کہ سپردِ خاک اسی جگہ کئی بجلیوں کا جلال ہے

○

قدِ رعنا سدا بہار درخت — تجھ سے گلشن میں شرمسار درخت

اسطرح دل ہوا غموں سے دوچار — جیسے سر جوڑتے ہیں چار درخت

آرزوئیں لہو سے ہیں سرسبز — جیسے دریا کے آر پار درخت

پوچھتی ہیں مری تمنّائیں! — لائے ہیں کس سے برگ و بار درخت

مجھ غریب الوطن کو کافی ہے — اک تصوّر کا سایہ دار درخت

کوئی نخلِ امید سا نہ ملا، — یوں تو ہونے کو ہیں ہزار درخت

دلِ اہلِ چمن پہ میل آیا — روکتے رہ گئے غبار درخت

وہ گلستاں میں آئے جب نازش

بن گئے پرچشم بہار درخت

رہِ وفا سے گریز کرنا ثبوتِ خود آگہی نہیں ہے

مقامِ دار و رسن سے ہٹ کر تو دُور تک زندگی نہیں ہے

یہی دلیلِ جوازِ مستی، یہی ہے بنیادِ مے پرستی

عطائے پیرِ مغاں سے کم تر مذاقِ تشنہ لبی نہیں ہے

نہ اب وہ سرگرمیٔ وفا ہے، نہ شعلہ ساماں کوئی تمنّا

جنوں تڑپتا ہوا نہیں ہے، نظر سلگتی ہوئی نہیں ہے

ابھی رخِ کائنات پر ہے سیاہیٔ شب کا رقصِ پیہم

یہ صبح کا آفتاب کیا ہے جو داغِ شرمندگی نہیں ہے

سحر کے مونس ہیں لالہ و گل، نجوم و مہتاب شب کے ساتھی

یہ سب مرے رازدارِ غم ہیں یہاں کوئی اجنبی نہیں ہے

نظر میں ہیں آج تک فروزاں وہ خواب کے مرمریں جزیرے

کہ جن کی خاموش رفعتوں پر کوئی کرن دھوپ کی نہیں ہے

امیدؔ کا دل سے ہے تعلق نہ جانے پھر بھی مآل کیا ہو
چراغ تک دسترس ہے لیکن گرفت میں روشنی نہیں ہے

ابھی ابھرتے ہوئے سویرے پہ ظلمتِ شب کی ہیں نگاہیں
بس ایسے ماحول میں ہوں نازشؔ جہاں ہنسی بھی ہنسی نہیں ہے

گئی بہار، قدم بوس ہو گئی ہے خزاں — درخت ریشمی پتوں کے ہو گئے عریاں

دیارِ شوق کی سرحد پہ بھی جمے نہ قدم — جو قافلے تھے سبک رَو ہوئے ہیں گرِ رواں

دہک رہا ہے کنارا کہ آگ کی ہے لکیر — وہ لو چلی ہے کہ سوکھی سمندروں کی زباں

یہ سیلِ وقت کسی کا بھی دوست بن نہ سکا — نہ جانے ہو گئے تحلیل کتنے کوہِ گراں

اٹھا تھا شعلہ صفت شوقِ سربلندی میں؛ — ابھر کے کتنی لکیروں میں بٹ گیا ہے دھواں

ہر ایک گھر میں بپا روشنی کا ماتم ہے — چراغ کتنے بجھائے ہوا کو ہوش کہاں

مری حیات کی تاریخ ہے یہی نازشؔ
کہ فرشِ خاک پہ ہیں سنگِ رہ گذر کے نشاں

میرے شہرِ دل میں ان کی بزم آرائی نہ پوچھ
روتی پھرتی ہے کہاں کھنڈروں میں تنہائی نہ پوچھ

عرش کو چھو کر ہوا ہے اپنے ہی عالم میں غرق
دل کی ہے کتنی بلندی کتنی گہرائی نہ پوچھ

وقت جس کی قید میں ہے وہ ہے ان کا انتظار
جس میں صدیاں بند رہتی ہیں وہ تنہائی نہ پوچھ

کتنی شمعوں کو بجھا کر چھین لی تھی روشنی
خیمۂ مغرب میں کیوں سورج کو نیند آئی نہ پوچھ

کھائی تھی کس کے جنوں سے عقل نے پہلے شکست
کتنی صدیوں کی ہے یہ سر بستہ دانائی نہ پوچھ

کھینچ دی تھی چار دیواری ہمارے ضبط نے
کو نسے گوشے سے یاد ان کی ابھر آئی نہ پوچھ

اپنی بدنامی کو نازشِ لوگ سمجھے برتری

کیسی خالی ہو گئی آغوشِ رسوائی نہ پوچھ

یہ سلسلۂ نور یہ تحریکِ بصر کیا

جلوہ نہیں تیرا تو ہے تحریکِ نظر کیا

کانٹے نے بھی پہنا ہے لباسِ گلِ تر کیا

ہوتی ہے نظر کیا، نظر آتی ہے نظر کیا

کوئی مری مایوسیٔ پیہم سے یہ پوچھے

جب دور کنارا ہو تو کہتا ہے بھنور کیا

اے ٹوٹے ہوئے دل وہی افسانہ وفا کا

تاریخ جو اپنی نہ بتائے وہ کھنڈر کیا

نظروں سے نہاں ہو کے گذرتے ہیں وہ سو بار

احساس کی بستی سے اڑی ہے یہ خبر کیا

یہ کیف یہ خوشبو یہ لطافت یہ اجالا

چھنتی ہے ترے گوشۂ دامن میں سحر کیا

وابستہ شبِ غم سے ہوں اس طرح میں نازش

یہ پوچھتا پھرتا ہوں کہ ہوتی ہے سحر کیا

حالات کے بوجھ سے ہے اک سو | ٹوٹیگی نہ وقت کی ترازو

ماہیّتِ گُل کو غور سے دیکھ | ہے رنگ کہ منجمد ہے خوشبو

اشجار ہیں دشت میں تن آور | ٹوٹے نہ ہوا کا کوئی بازو

مجموعہ نزاکتوں کا ہیں یہ | کلیوں کو فقط نگاہ سے چھو

آنکھوں نے کہا ہے شعر نازش

پلکوں سے گرا ہے جو بھی آنسو

○

اب دل میں آرزووں کے آثار دیکھنا

ویرانیوں میں شہر نمودار دیکھنا

کون آگیا چراغ کی لو کس نے تیز کی؟

شعلے سے ہو گیا ہے کسے پیار دیکھنا

دو اشک چشمِ ناز کی دنیا بدل گئے

اک برگِ گل پہ اوس کی مقدار دیکھنا

منصور اک گرفت میں منصور ہو گیا

بندہ نوازئ رسن و دار دیکھنا

یہ کون جھانکتا ہے دریچے سے بار بار

لَو دے رہا ہے سایۂ دیوار دیکھنا

دامن سے دور رہ گیا ہاتھ آفتاب کا

اس آنے والی صبح کی رفتار دیکھنا

آئی جو گردِ راہ تو دامن جھٹک دیا

آوارگانِ شوق کا کردار دیکھنا

تم کو اگر نہ ہو کوئی احساسِ کمتری

نازش کی چشمِ شوق کا معیار دیکھنا

سحر ملنے کو خود آئی ہے چلئے

حصارِ شب سے تو باہر نکلئے

نظر آئے جہاں بھی کوئی رہبر

وہیں سے راستہ اپنا بدلئے

پڑے ہیں اس لئے راہوں میں پتھر

کہ ٹھوکر کھائیے اور پھر سنبھلئے

بہاروں نے تو چھوڑا گل کا دامن

چمن کی خاک اب چہرے پہ ملئے

جہاں کی سرد مہری کہہ رہی ہے

کہ برفانی ہوائیں رہ کے چلیے

نہ رکھیے دھوپ کی تیزی ہمیشہ

کبھی تو سائے کے سانچے میں ڈھلیے

چٹانیں ہر طرف ہیں غم کی نازش

جدھر چلنا ہو دریا بن کے چلیے

شہر میں تنہا ہوں میں لذّت کشِ آزارِ دوست

مجھ سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کوئی شہکار دوست

مسکراہٹ کی ضیا، کرنیں طلوعِ مہر کی

پھول کھلنے کا عمل آئینۂ گفتارِ دوست

اُس حرارت سے ابھی تک ہے رگوں میں خونِ گرم

ہلکی ہلکی آنچ دیکھی تھی سرِ رُخسارِ دوست

وقت تھک کر سو گیا ہے ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں

گردشیں ٹھہری ہیں زیرِ سایۂ دیوارِ دوست

سوچیئے تو کتنی صدیوں کا سفر درکار ہے

دیکھیئے تو کس قدر نزدیک ہے دیوارِ دوست

وقت کا فرمان نازش ٹل نہیں سکتا کبھی

سب کی قسمت کا نوشتہ ہے سرِ دیوارِ دوست

بے کیف زندگی ہے وہ کوئی ملال دے

ساکت ہے سطحِ جھیل کی پتھر ہی ڈال دے

وقتِ رواں کی چاپ سے بنتے ہیں حادثے

اِن آہٹوں کو گیت کے سانچے میں ڈھال دے

آواز بن کے چیخ اُٹھے ان کی خامشی

اے جوشِ انتقام وہ طرزِ سوال دے

آتی رہے لڑکھڑاتی ہوئی صبح میری سمت

سورج کے پاؤں سے کوئی کانٹا نکال دے

اصرار کر رہی ہے یہ نازش کسی کی یاد

تو مجھ کو اپنے دامِ غزل سے نکال دے

کھوئے ہوئے تھے اپنی ہی تنہائیوں میں ہم

اُبھرے ہیں ڈوب ڈوب کے گہرائیوں میں ہم

رکھتے رہے نہ جانے کس انداز سے قدم

ٹھہرے ہیں طاق حادثہ پیمائیوں میں ہم

یہ اور بات ہونٹ کبھی تر نہ کر سکے

ہر چند تیرتے رہے پُروائیوں میں ہم

عظمت ملے تو اُس کے تعاقب میں رہ نہ جائیں

اب تک تو پیش پیش ہیں رسوائیوں میں ہم

ہو لاکھ سر پہ شعلہ فشاں زندگی کی دھوپ

چلتے رہیں گے موت کی پرچھائیوں میں ہم

اُبھرے تھے ساتھ موج کے، ڈوبے بھنور کے ساتھ

لیکر گئے ہیں سطح کو گہرائیوں میں ہم

یکجا ہوئے حیات کی چٹکی سے چونک کر

بکھرے ہوئے تھے ذات کی پہنائیوں میں ہم

نازش ہمیں تو خارِ چمن بھی عزیز ہے

محدود کیا ہوں پھول کی رعنائیوں میں ہم

کیا ہوئی گرمیِ بازار خبر تو لاؤ
طالبانِ لب و رخسار خبر تو لاؤ

کہیں مقتل میں مری زندگیٔ شوق نہ ہو
کس کی پائل کی ہے جھنکار خبر تو لاؤ

مجھ سے آگے جو یہ بڑھتے نہیں کیوں انکے قدم
کون ہے قافلہ سالار خبر تو لاؤ

سر خمیدہ ہمیں ہر شخص نظر آتا ہے
سر پہ احساں ہے کہ تلوار خبر تو لاؤ

کوئی پہنچا ہے یقیناً سرِ معراجِ حیات
کون رقصاں ہے سرِ دار خبر تو لاؤ

دوستو دیکھو کہاں جم گئے سورج کے قدم
کون ہے رات کے اس پار خبر تو لاؤ

ہدفِ سنگِ تغافل کہیں نازش تو نہیں
یا کوئی اور ہے فنکار خبر تو لاؤ

پوچھو آنے والے دنوں سے کیا کیا لے کر آئے ہیں

اب کے برس تو پھول ہی برسے اور نہ پتھر آئے ہیں

تیرے در سے خاک اُٹھا کر ہم نے قناعت کر لی ہے

موتی یوں تو جیب میں لے کر کتنے سمندر آئے ہیں

کتنی راتیں دن کی طلب میں ماری ماری پھرتی ہیں

کتنے اندھیرے ہاتھ پسارے صبح کے در پر آئے ہیں

دل میں آنے والے غم تو آ کے بسے اور ایسے بسے

چشمۂ آبِ خضر میں جیسے وہ منہ دھو کر آئے ہیں

ایک سکوں کی خاطر نازشؔ کتنی بلائیں لی ہیں مول

پھر بھی گردشِ دوراں سے ہم ہاتھ چھڑا کر آئے ہیں

وہ دورِ عمر، دورِ تمنّا کہیں جسے

اک زخم ہے کہ زخمِ گوارا کہیں جسے

دنیا بھی وہ ملی ہے تماشا کہیں جسے

لاکھوں تغیّرات کا میلہ کہیں جسے

راہِ حیات میں مجھے پہچان کر بڑھی

وہ رات زندگی کا سویرا کہیں جسے

امواج کے خطوط سے ہے دور وہ لکیر

حدِّ نظر میں ہو تو کنارا کہیں جسے

آوارگانِ شوق کو لاتا ہے رقص میں

پتّوں کا شور نغمۂ صحرا کہیں جسے

کوئی تعلّقات سے بیگانہ ہو تو یوں

تنہائیاں بھی دیکھ کے تنہا کہیں جسے

اس دورِ خود شناس میں آئے وہ سامنے

تجھ سا اگر نہیں ہو تو مجھ سا کہیں جسے

بیگانگی کے خواب سے چونکا گیا مجھے

تیرا خیال سنگِ تقاضا کہیں جسے

نازشؔ علاج اس کا جہاں میں کہیں نہیں

احباب کی نوازشِ بے جا کہیں جسے

○

فریب کا آفتاب ابھرا، خلوص کا چاند ہے گہن میں

جہاں وقارِ آدمی کا کم ہو رہیگا کون ایسی انجمن میں

میں ہر قدم پر نئی امنگوں سے اس لئے آشنا رہا ہوں

ترا تبسم بھی کھیلتا تھا حوادثِ حوصلہ شکن میں

یہ کس نے میلا کیا ہے دامن نئے چراغوں کی روشنی کا

کسے خبر تھی نئے اندھیرے چھپے ہوئے ہیں کرن کرن میں

بہار تھی تاجِ گل پہ نازاں مگر یہ تھا دورِ ناشناسی

بڑھی خس و خار کی وہ قیمت کہ پھول شرما گئے چمن میں

جو اُن کے در سے عطا ہوئے تھے جو انکے قدموں کو چھو کے ابھرے

وہ انقلابات ڈھل گئے ہیں مری جبیں کی شکن شکن میں

اُمید افزا تھیں جتنی کرنیں ہماری زنجیر پا بنی ہیں

جسے سمجھتے تھے شمعِ منزل چراغ تھا دستِ راہزن میں

سرور کا اہتمام نازش بقدرِ ذوقِ طلب نہیں ہے

شرابِ تازہ کی تلخیاں بھی شریک ہیں بادۂ کہن میں

○

بادل تھے مہیب اور گھنے جنگل کی ہوا تھی

ہر رنگ میں بیدار مرے غم کی فضا تھی

قسمت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے راہی

جب وہم کی بنیاد پہ تشکیلِ خدا تھی

سوئے ہوئے احساس کو یہ کس نے جھنجھوڑا

کیا دورِ گزشتہ کے پلٹنے کی ادا تھی

گلزار کی جو آگ تھی، صحرا میں بجھا دی

یہ کون بتائے وہ صبا تھی کہ بلا تھی

اک خشک سے پتّے کو ہوا نے دیئے شہپر

طوفان کی تحریک مری راہنما تھی

انجامِ خودی جان کے دل چونک اٹھا ہے

شاید کسی دیوار کے گرنے کی صدا تھی

صدیوں کا جگر چیر کے پہنچی ہے جو ہم تک

وہ دور کے مہکے ہوئے ماضی کی ہوا تھی

ہر سر پہ وہی تجربے پیشِ نظر آئے

نازش مری ہستی کسی گنبد کی صدا تھی

دہکے ہوئے پتّھر وہ لئے سر پہ کھڑا تھا

پہنے ہوئے جو چاند ستاروں کی قبا تھا

قیمت میں ملے خشک ہوا کے مجھے جھونکے

دستِ گل ولالہ میں مرا خُون رَچا تھا

اس خستہ صحیفے میں تھی ویرانیٔ صحرا

آنگن میں مرے کون مقدّر کے سوا تھا

ہم نے بھی بتائی تھی اُسے راہِ محبت

ہم کو بھی کبھی خضر بیاباں میں ملا تھا

ہر سانس سے سنتا رہا پیغام کسی کا

تا عُمر میں پابستۂ زنجیرِ صدا تھا

دیکھا تھا مقدر کی طرح اس کو شکستہ

بازارِ تمنا میں جو آئینہ سجا تھا

وہ میری سماعت سے فراموش ہے نازش

دروازے کی دستک سے کوئی نام سُنا تھا

جہاں صدرِ انجمن ہو گا — صبحِ نَو کا وہی وطن ہو گا

ن اندھیرے میں ضَو فگن ہو گا — اس کے لب پر کوئی سخن ہو گا

ے دُھن میں جو گامزن ہو گا — ہر قدم فاصلہ شکن ہو گا

ہ رفتہ دُھواں چراغوں کا — کبھی آشوبِ انجمن ہو گا

اُجالا جو صبح لائی ہے — شبِ تاریک کا کفن ہو گا

ستے میں نہ ہو گی تنہائی — راہبر ہو گا راہزن ہو گا

فِ ہر دور جگمگائے گا — جلوہ گستر چراغِ فن ہو گا

حِ نازش سنائیگی غزلیں — جان سے جب فراقِ تن ہو گا

آئے چلنے پہ جو ہم وقت کی رفتار ہوئے
کچھ نئے حادثے رکتے ہی نمودار ہوئے

حوصلے بڑھ کے تصادم کے طلبگار ہوئے
کیا سفینے تھے کہ طوفاں کے خریدار ہوئے

کنجِ خاموشیٔ فطرت سے نکل کر ہم لوگ
زندگی تیرے لئے رونقِ بازار ہوئے

میرا کیا لیں گے اگر سنگِ حوادث برسے
عزمِ پختہ نہ ہوئے شیشے کی دیوار ہوئے

حادثوں کو جو میں گِن لوں تو بتاؤں تفصیل
میری تحریکِ تبسّم پہ بہت وار ہوئے

لا کے ماتھے پہ شکن وقت سے سمجھوتہ کیا
غم کی تاریخ کے ہم اتنے گنہگار ہوئے

باغِ افکار کے سائے میں ہوں ساکنِ نازش
ڈالیوں سے جو ثمر ٹوٹے وہ اشعار ہوئے

وہ ایک نام جو گیسوئے غم کا شانہ تھا

وہ اک حسین تعارف جو غائبانہ تھا

مرے جنوں پہ برستے رہے بہار کے پھول

ہر ایک سنگ میں پنہاں نگار خانہ تھا

رکے جو ہم تو ہوئی تیز گردشِ دوراں

قدم بڑھائے تو ٹھہرا ہوا زمانہ تھا

غمِ حیات کے دورِ عتاب میں نازش

مری ہنسی کا ہر انداز مجرمانہ تھا

حیثیّتِ مہر و مہ و انجم تو ذرا دیکھ !

پیوند ہیں کتنے سرِ دامانِ خلا دیکھ

دیتی ہے اُجالے کی یہ قیمت شَفَقِ شام

سورج کے کفِ دست میں ہے رنگِ حنا دیکھ

پائے گا نشاں تک نہ اُجالے کی کرن کا

اے شوقِ طلب چاند کے غاروں میں بھی جا دیکھ

ہم خون سے ہیں پرورشِ وقت میں مصروف

دیکھی نہیں تو نے تو حوادث کی غذا دیکھ

اس دَور میں لہروں ہی پہ تکیہ رہے ناآزش

وہ دُور کنارے پہ ہے طوفان بپا دیکھ

وہ فضا میں رنگ اچھالے، وہ دھنک میں روز جھُولے

وہی بادلوں سے کھیلے جو نظر نظر کو چھُو لے

مجھے روز کھو رہے ہیں، مجھے روز پا رہے ہیں

مرے جذب کی حدوں میں مرے شوق کے بگولے

مری عزم پسند فطرت کا ازل میں تھا تقاضا

یہ جہاں کے دکھ اٹھا لے، یہ ستم کی آرزو لے

یہ جو روح میں کھنک ہے رہے تا حیات قائم

دو جہاں مجھے بھلا دیں، مگر اس کا غم نہ بھولے

یہ ترے جمال کی ضَو، یہ ترے جلال کی رَو

شب و روز اُٹھ رہے ہیں مہ و مہر کے بگولے

ترے رنگِ رخ سے کم ہے مرے خونِ دل کا جلوہ

وہ شفق کہاں سے لاؤں جو ہزار بار پھولے

میں حسین نغمہ بنکر ابھی انجمن پہ چھاؤں

جو وہ مسکرا کے نازشؔ مرے سازِ دل کو چھو لے

جو چیرتا ہے کناروں کا دل وہی طوفاں

نئے جزیروں کی لے کر خبر بھی آتا ہے

ملے گا کیا اس اندھیرے کو چھوڑ کر نازشؔ

کہ اس دریچے سے سورج نظر بھی آتا ہے

نہ اڑائیگی اُن کے سائے دھوپ
آئے گھر میں ہزار آئے دھوپ

آندھیاں لے اڑیں نہ مغرب تک
بڑھے ہمت کے سائے سائے دھوپ

مجھ کو تیرا جمال ہے درکار
چاندنی میں کبھی نہائے دھوپ

تشنگی سے ہُوا ہے چہرہ زرد
چلی سورج کے سائے سائے دھوپ

ہم پہ احسان کرچکی ہے بہت
اپنے سورج کے ساتھ جائے دھوپ

اُن کے آگے چراغ کیا ٹھہریں
شمع اپنی ذرا جلائے دھوپ

اپنی تیرہ نصیبیاں توبہ!
ان ہواؤں میں اڑنہ جائے دھوپ

نہ بھے رُت دوپہر کا سونا
دوپہر کو پگھل نہ جائے دھوپ

کس فضا میں ہم آگئے نازش
روئے شبنم، نہ مسکرائے دھوپ

○

ہم آج اپنے تصوّر میں بار بار آئے

گزشتہ عمر کئی مرتبہ گزار آئے

بہارِ لالہ و گل اتنی مختصر کیوں ہو

کہ اعتبار کی حد تک نہ اعتبار آئے

گلوں کا جائزہ لیکر شمار کرتا ہوں

مرے نصیب میں زخموں کے کتنے ہار آئے

طلب شناس ستاروں کی انجمن میں گئے

نظر سے وادیٔ مہتاب میں پکار آئے

ہر ایک دِل کو کیا روشناس اے نازش

ہر آئینے میں وہی عکس ہم اُتار آئے

کسقدر انوار میخانے میں ہیں
چاند سورج ایک پیمانے میں ہیں

شمع کی ضو میں نہ پروانے میں ہیں
جتنے شعلے اپنے بیگانے میں ہیں

اک تصور میں ہیں سارے ممکنات
محفلیں سب آئینہ خانے میں ہیں

کٹ گئے خودداریوں کے قافلے
کتنے خوں اک ہاتھ پھیلانے میں ہیں

رُوح نازش کی اُڑ گئی مثلِ بُو
چند لمحے پھُول مُرجھانے میں ہیں

ہوائیں چل رہی ہیں پھول رُسوا ہوتے جاتے ہیں
لباس رنگ و بو پا کر بھی عریانی نہیں جاتی

نظر اُن پر اُٹھی تو جا کے کیسا حُسن لے آئی
مری پرچھائیں بھی اب مجھ سے پہچانی نہیں جا

○

ضبط ہے جوشِ تمنّا کے خلاف

موج اُبھرنے لگی دریا کے خلاف

دل پہ قبضہ تھا ہوائے غم کا

آگ بڑھتی رہی صحرا کے خلاف

وقت مختار ہوا جاتا ہے

کسی مجبور کی دنیا کے خلاف

طالبِ عشرتِ ماضی ہے تو چل

اپنے ہی نقشِ کفِ پا کے خلاف

غم کے سورج کی نگاہیں نازش

گرم ہیں شمعِ تمنّا کے خلاف

محفل میں تری ہوں بھی تو محرومِ شرف ہوں

موتی ہوں صدف میں نہ سمندر کا صدف ہوں

تحریف نہیں نامۂ تقدیر میں ممکن

تحریر کے قابل نہیں وہ خامۂ جف ہوں

پہنچے ہی نہیں دھوپ کی کرنوں کے کبھی ہاتھ

ہر راہ میں ہر گام پہ سایوں کا ہدف ہوں

رہ رہ کے نئے حادثے ہوتے ہیں مسلّط

ترتیبِ عناصر کی میں ٹوٹی ہوئی صف ہوں

ہاتھوں کی لکیریں ہیں کہ فطرت کی زبانیں

اک عمر سے میں صورتِ حالات بکف ہوں

ہیں کچھ بھی نہیں پھر بھی یہ معراج ہے میری

انسان ہوں اور چاند کے آنگن کا خزف ہوں

میں بجھتی ہوئی شمع سرِ بزم ہوں نازش

اک سنگِ شکستہ سرِ دیوارِ سلف ہوں

شب ہوتی صبح کی دلیلوں میں
دن ہوا تیرہ ان فصیلوں میں

دل کو تسکیں ہے صرف امیدوں پر
کیا دفینے ہیں غم کے ٹیلوں میں

زمرے عشّاق کے ہیں سارے جدا
لوگ تقسیم ہیں قبیلوں میں

حاصل عزم ہوتی ہے منزل
کامیابی نہیں وسیلوں میں

اپنے دکھ درد بٹ نہیں سکتے
غم کی دولت ہے ان بخیلوں میں

سائے ہر دل پہ غم نے ڈالے ہیں
عکس کہسار کے ہیں جھیلوں میں

ہیں مُقِر عشق کے نہ ہیں منکر
ہم تو کھوئے گئے دلیلوں میں

ہم جنون و خرد کے مارے ہیں
بحث جاری ہے ان وکیلوں میں

دل کے ارمان دِل میں ہیں نازش

طائر اُترے ہیں کیسی جھیلوں میں

دل ہے اپنا کوئی ارمان رہے یا نہ رہے

بات رہ جائیگی عنوان رہے یا نہ رہے

ایک رفتار سے چلتی ہے تغیّر کی ہوا

خاک اُڑ اُڑ کے پریشان رہے یا نہ رہے

اختیارات تمہارے ہمیں تسلیم مگر،

عافیت سے کوئی انسان رہے یا نہ رہے

آ گئی وقت کے ہاتھوں میں اندھیروں کی کمان

دیکھئے صبح کا امکان رہے یا نہ رہے،

آزمالوں میں ابھی حوصلہ ورنہ کل تک

میرے معیار کا طوفان رہے یا نہ رہے

پتّیاں کچھ گُلِ افسُردہ کی چُن کر رکھ لوں

پھر گلستاں کی یہ پہچان رہے یا نہ رہے

موت گزری ہے مری زیست کو چھو کر نازش*

میری تخلیق میں اب جان رہے یا نہ رہے

---

* ایک مہلک بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد

شرف ترے سفر کا نہ قدم سے استفادہ

یہ اُداس اُداس منزل یہ بجھا بجھا سا جادہ

دلوں پہ رقص میں ہے نظر اُن کی بے ارادہ

ابھی پھول چن رہی ہے وہ مری بہارِ سادہ

ی چھو سکی نہ مجھ کو کوئی گردشِ زمانہ

ترا حلقۂ نظر تھا کہ حصارِ جام و بادہ

آرزو کی خاطر وہ نگاہ لے کے آئی

کبھی صبحِ نو کی پوشش کبھی شام کا لبادہ

مجھے مستقل سکوں دے مجھے تلخیاں عطا کر

مری ہر خوشی کریگی ترے غم سے استفاد

مری شدّتِ طلب نے جو قدم مرے بڑھائے

کہیں رہ گئی ہے منزل کہیں کھو گیا ہے جاد

کوئی آفتابِ تازہ ہے امید کے افق پر

مرے سوزِ جاں سے کچھ کم ترے رُخ سے کچھ زیا

مرے دل سے اُن کے دل تک ہے طویل راہِ نازش

وہ مسرتوں کے سلطاں ہیں غموں کا شاہزاد

نہ جانے تھا کونسا مسافر چمن کا عالم بدل گیا وہ

مثالِ موجِ نسیم آیا برنگِ خوشبو نکل گیا وہ

سمیٹ کر زرنگار تارے قمر کے سانچے میں ڈھل گیا وہ

بکھیر کر چاندنی کا منظر اندھیری شب کو بدل گیا وہ

فضا میں چھائی ہوئی تھی بدلی بہار بھی مسکرا رہی تھی

مزاج رنگیں، نظر میں مستی سُنا کے اپنی غزل گیا وہ

چمن میں جس طرح پھول مہکیں اور اپنی منزل کے ہوں مُسافر

یہی ہے جولانیٔ طبیعت جو آج آیا تو کل گیا وہ

ہر ایک گوشے کو جگمگا کر نثار کر کے کرن کرن کو

چراغ روشن تھا انجمن میں، خود آگ میں اپنی جل گیا وہ

نظر حقیقت شناس ہو تو کسی کی گہرائیاں سمجھ لے

نہیں تھے الفاظ اس کے شایاں، سکوتِ معنی میں ڈھل گیا وہ

نظامِ شمسی ہوا معطل زمیں کی گردش میں فرق آیا

قیامت آئیگی وقت پر کیوں۔ کہ کر کے رُت بدل گیا وہ

سمجھ رہے ہیں سمجھنے والے کہ "وقت" تھا اس کا نام نازش

قیام اس کا تھا غیر ممکن۔ پلک جھپکتے ہی ٹل گیا وہ

آخرِ شب ہے کون نغمہ طراز
دل کی وادی میں گونج اٹھی آواز

غم کی تاریکیوں میں ان کی نظر
جیسے پہلی کرن کا ہو انداز!

فرصتِ عمر کم، ہزار الم
جیسے سائے ہوں وقتِ شام دراز

عمرِ الفت کا ماحصل یہ ہے
تم ہو میرے ضمیر کی آواز

وہی ٹکڑے ہیں جانِ افسانہ،
ڈوبتی ہے جہاں جہاں آواز

میں بھی دو اشک لے کے آیا ہوں
اے قمر ساز، اے ستارہ نواز

ہائے انجامِ شوق اے نازش
سب فراموش ہے، مگر آغاز

کسی عارضی خوشی کا جو کوئی شکار ہوتا
مجھے غم کی عظمتوں پر جو نہ اعتبار ہوتا

یہ فروغِ دشت و صحرا ہے شکستِ گلستاں سے
نہ گلوں کا رنگ اڑتا نہ کہیں غبار ہوتا

مرے نخلِ زندگی نے کئی رخ ہوا کے دیکھے
کوئی رُت کبھی نہ آتی تو سدا بہار ہوتا

تری یاد اگر نہ ہوتی تو حیات کا سفینہ
نہ عبورِ شام کرتا نہ سحر کے پار ہوتا

مری عظمتِ وفا سے وہ کبھی شکست کھا کر

مرا عزم چھین لیتے اگر اختیار ہوتا

تر و تازہ یوں نہ رہتے کبھی پھول مہر دمہ کے
چمنِ جہاں کا موسم جو نہ خوشگوار ہوتا
تھا اگرچہ منتظر میں اگر آپ آ بھی جاتے
تو تمام عمر اپنا مجھے انتظار ہوتا

جو نہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا ترے جبر کا تسلسل

نظر احتجاج کرتی نہ نفس پکار ہوتا

مرے مسلکِ وفا میں تری دید تھی عبادت

جو نظر نہ تجھ پہ پڑتی میں گناہگار ہوتا

مرا اشکِ خوں ہے نازش مرے تجربے کا حاصل

جو وفورِ غم میں ہنستا تو یہ شاہکار ہوتا

صرف ہم کو نہیں راہوں میں نکلنا ہوگا

آئیگا وقت تو دیوار کو چلنا ہوگا

بزم کا منظرِ تاریک بدلنا ہوگا ــ!

شمع بُجھ جائیگی تو خود ہمیں جلنا ہوگا

مجھکو ہنسنے کی اجازت نہ دے اے شدّتِ غم

ورنہ افسانے کا عنوان بدلنا ہوگا

رہ کے ہمراہ سفر میں مرا سایہ نہ بنو

میں جو گر جاؤں کہیں تم کو سنبھلنا ہوگا

یادیں آئیں گی بہت مجھ کو منانے نازشؔ

آخری سانس کو تھم تھم کے نکلنا ہوگا

اے روشنیوں کے رہنے والو
کوئی تو کرن ادھر اُچھالو

طوفان کی سمت جانے والو
ساحل کو بھی ناؤ میں بُلا لو

تم غرق ہوئے جو بحرِ غم میں !
موتی تہِ آب ہیں نکالو

ہر چیز جہاں کی ہے معمّہ
تم خود ہی جواب دو سوالو

اے راہ کے حاکمو جو ضد ہے
سایہ بھی شجر کا کاٹ ڈالو

جاتے ہو تو جاؤ کر کے تنہا
سائے کو تو پہلے تم اُٹھا لو

شبنم کو اُڑا کے لے گئی دھوپ
کرنوں کو نچوڑ کر نکالو

کل تک تو سنو گے لاکھ باتیں
کیوں آج کی بات کل پہ ٹالو

اِک زاویہ چھوڑ دو جنوں کا
بنیادِ خرد نہ کھود ڈالو

میرے گھر تک کبھی نہ آئی چھاؤں　　دھوپ میری ہے اور پرائی چھاؤں

راہ میں ہیں کئی شجر ایسے　　دی ہے مجھ کو چھنی چھنائی چھاؤں

دھوپ بھیجی گئی تقاضے کو　　لیگی اب مجھ سے پائی پائی چھاؤں

کہہ رہی ہے یہ چھاؤں تاروں کی　　چاند سے مانگ لے طلائی چھاؤں

جانے جانے کسی نے مغرب تک　　صبح تا شب بہت بہائی چھاؤں

دھوپ پیڑوں سے چھن رہی تھی بہت　　میں یہ سمجھا کہ مسکرائی چھاؤں

غم نہ ہو دھوپ چھاؤں کا نازش

دے مقدر اگر خلائی یہ چھاؤں

یہ کس زمانے کے نقش پا ہیں کہ جم کر آئینہ بن گئے ہیں

ان آئینوں میں گزشتہ دنیا ہنسی ہماری اُڑا رہی ہے

یہ آرزو ہے خیال بن کر خود اپنے پہلو میں ڈوب جاؤں

کہ خلوتِ دل سے آج مجھکو کسی کی آواز آ رہی ہے

آسماں پر گھٹا کے پہرے ہیں
غم کے بادل اب اور گہرے ہیں

عہدِ زریں ہیں دن جوانی کے
شوق کے راستے سنہرے ہیں

کوئی سنتا نہیں فسانۂ غم
چاند تارے ازل کے بہرے ہیں

شاید ان کی نظر نہیں شامل
حادثے آجکل اکہرے ہیں

تھے جو راہوں سے بیخبر نازنیں
رہبرِ کارواں وہ ٹھہرے ہیں

جو ہے نئے وقت کا تقاضا تو یہ روش اختیار کر لوں
کہ خار آنکھوں میں چن کے رکھ لوں دہکتے شعلوں کو پیار کر لوں

چمن کی فطرت سمجھ رہا ہوں خزاں کو بھی جانتا ہوں لیکن
اشارے کرتے ہیں غنچہ و گل کہ بند گئی بہار کر لوں

یہ دیکھنا ہے رہِ طلب میں ملینگی گمراہیاں کہاں تک
فریب منزل جو دے رہے ہیں، میں وہ بگولے شمار کر لوں

جنوں نے یہ مشورہ دیا ہے نہ ہو کمی ان کی جستجو میں

شعور کی مصلحت یہی ہے شکست کا اعتبار کرلوں

کہاں سے لاؤں میں وہ نگاہیں جو کشمکش خار و گل کی دیکھیں

خدا جو توفیق مجھ کو دیدے، نظارۂ کارزار کرلوں

ابھرتے سورج کی روشنی کے ابھی کئی زاویئے ہیں پنہاں

کرن جو پہچانتی ہے مجھکو میں اس کا اور انتظار کرلوں

رواروی میں ہے عمر میری شکار ہوں غلبۂ سفر کا

ذرا ٹھہر جائے وقت کی رَو شکایتِ روزگار کرلوں

مسلسل اک انقلاب کیا کیا ضمیر کو چھو رہا ہے نازش

اگر کرم کا نہ آسرا ہو تو سرکشی اختیار کرلوں

غم کسی کا نہیں، مگر میرا
اور یہ پھر وہ بھی عمر بھر میرا
کون منزل پہ روشنی ڈالے
پھیلتی چھاؤں ہے سفر میرا
ان کا طوفانِ التفات نہ پوچھ
بجھ گیا شعلۂ نظر میرا
میری نظروں میں ہے مری منزل
میرے قدموں میں ہے سفر میرا
حسن کی دھوپ اور چمکی ہے
دیکھ کر سایۂ نظر میرا
جلوے آنے لگے سلامی کو
کھل گیا پرچمِ نظر میرا
جام ہے مہرِ میکدہ نازش
خطِ مے، خطِ دوپہر میرا

التفات ان کا، چمن جھوم رہا ہو جیسے
میرے احساس کی وادی میں گھٹا ہو جیسے

باخبر ہو مرے عالم سے، خدا ہو نہ جیسے،
لوحِ تقدیر پہ کچھ تم نے لکھا ہو جیسے

ایک ہی رنگ رہا فکر و نظر کا محور
ایک ہی پھول گلستاں میں کھِلا ہو جیسے

مجھ سے ان کی نگہِ لطف کو نسبت کیا ہے
درمیانِ سحر و شام خلا ہو جیسے

ہو کے محرومِ خوشی ایسی ندامت ہے مجھے
غم کی تخلیق بھی میری ہی خطا ہو جیسے

داستاں خیز ہے ماحولِ شبِ تنہائی
خامشی میں ترا غم بول رہا ہو جیسے

یہ شب و روز پسِ ترکِ مراسم توبہ

زندگی میری ضرورت سے سِوا ہو جیسے

جھلمِلاتا سا چراغِ رہِ اُمیّد ہوں میں

وقت بھولے سے مجھے چھوڑ گیا ہو جیسے

کوئی بول دل کو مرے توڑ گیا ہے نازِ سخن

دستِ میخوار سے پیمانہ گِرتا ہو جیسے

آس سے جب طبیعت بہلتی رہی
موت آتی رہی اور ٹلتی رہی

آگ غم کی شب و روز جلتی رہی
وقت کی برف پیہم پگھلتی رہی

ہر قدم پر جنوں تو گل افشاں رہا
عقل شعلوں پہ کروٹ بدلتی رہی

جس نے پھولوں کی شمعوں کو گُل کر دیا
وہ ہوا بھی بہاروں میں پلتی رہی

گردشِ وقت تھی میری ہمدرد بھی
غم کا پنکھا شب و روز جھلتی رہی

ذکر نے تیرے سورج کو چونکا دیا　　صبح تک شام کی بات چلتی رہی

مرحلے کس روانی سے طے ہو گئے　　زندگی جیسے پانی پہ چلتی رہی

دُور منزل سے نازش رہے عمر بھر

زیست ہر گام پر رُخ بدلتی رہی

مشکل ہے سفینے کی تکیں سے شناسائی

ساحل بھی ہے طوفاں کی رکی ہوئی انگڑائی

جب شورشِ بے پایاں تاریخ نے دُہرائی

آنکھوں میں سمٹ آئی ہر دَور کی بینائی

بے فیض سا اک کعبہ تم نے بھی بنایا ہے

ہم کو بھی نہیں آتے آدابِ جبیں سائی

یوں ترکِ مراسم سے تم مجھکو ڈراتے ہو

جیسے کبھی دنیا میں دیکھی نہ ہو تنہائی

بگڑے ہیں کچھ اس عنواں حالاتِ جہاں نازش

اٹھا تھا دھواں پہلے پھر آگ نظر آئی

قصۂ غم کا پاؤں گا عنوان بڑی مشکل سے

ہو گی یہ دشواری کبھی آسان بڑی مشکل سے

ان کا تبسم عزم ہمارا۔ دونوں مل کر روکیں

گردشِ دوران کی نکلے گی جان بڑی مشکل سے

گہرے نقش پہ عکس خوشی کا کیا تبدیلی لاتا

غم کے گوشے ہوتے ہیں ویران بڑی مشکل سے

قحط الفت کا کال وفا کا اک دن گھٹ جائیگا

پاؤں سمیٹا کرتا ہے بحران بڑی مشکل سے

دھوپ کے پیلے سے صفحے پر تازہ خبریں دیکھیں

صبحِ نو کا اب ہوگا امکان بڑی مشکل سے

ایک تمنّا ایک اُمّید اور ایک تصوّر ان کا

جمع کیا یہ جینے کا سامان بڑی مشکل سے

در در رسانی اس نے بھی کچھ کم کردی تھی نازش

ہم نے بھی تحریر کیا دیوان بڑی مشکل سے

آئینہ اُن کو دیکھ رہا ہے مری طرح

بے جان چیز پر اثرِ نفسیات ہے

میں اور خوشی، فریب کہیں وقت کا نہ ہو

دیکھو تو سطحِ خاک پہ رقصِ ہوا نہ ہو

کھولا گیا ہے زہر سرِ چشمۂ حیات

اب کوئی خضر تشنۂ آبِ بقا نہ ہو — !

میری نگاہ روز بناتی رہی نقوش

مجھ سے تمہارا طاقِ تغافل سجا نہ ہو

محدود دائرے میں گذرتی ہے زندگی

محسوس کس کو تلخیٔ آب و ہوا نہ ہو

ساکت کھڑا ہوں تیرگیٔ جبر و کرب میں

میری خودی کا چاند ہی گہنا گیا نہ ہو

گرتی رہیں ہواؤں سے پھولوں کی پتّیاں

میں سوچتا رہا تری آوازِ پا نہ ہو

محدود شور و شر میں ہے نازش ہماری زیست
جب جرم ہو سکوں کی طلب کیوں سزا نہ ہو

ف الگ دونوں لے کے آئے دلوں کی وابستگی کا شعلہ
اِدھر مرے پیار کا اجالا اُدھر تمہاری ہنسی کا شعلہ

ا نے یہ کس کی یاد آئی کہ گرم آنسو نکل رہے ہیں
دوبارہ لَو دے رہا ہے شاید ہمارے دل میں کبھی کا شعلہ

ں کی سوزش بتا رہی ہے کہ حرفِ شکوہ نہ دب سکیگا
گرفت ہونٹوں کی چل رہی ہے نہ جاگ اُٹھے خامشی کا شعلہ

ودی نے شکست کھائی تو فاتحانہ شعور جاگا
ہوئے اندھیرے جو اور گہرے چمک اٹھا آگہی کا شعلہ

ہواؤں کا رُخ بدل رہا ہے یہی ہے تشویش مجھکو نازشؔ

کہ راکھ ہو کر بکھر نہ جائے کہیں مری زندگی کا شعلہ

دورِ تسکیں سے اب امیدِ ملاقات نہیں

شاید اس دھوپ کے میداں میں کوئی رات نہیں

آجکل وزن محبّت میں کہاں باقی ہے

بارِ غم کوئی اٹھائے تو نئی بات نہیں

ہنس کے کر دینگے اسے گردشِ دوراں کے سپرد

زندگی تیری عطا کی ہوئی سوغات نہیں

آرزو دل میں لطافت سے رہا کرتی ہے

جس طرح پھول پہ خوشبو کے نشانات نہیں

منجمد تیرگی وقت ہوئی ہے نازشؔ

شاید اس رات کے بعد اور کوئی رات نہیں

•

خوشی بھی حادثے سے کم نہیں ہے

تبسّم زخم ہے مرہم نہیں ہے

جسے پائے گرفت اہلِ خرد کی !

جنوں کی لہر میں وہ خم نہیں ہے

جھجک ہر موڑ پر ہے زندگی کو

قرارِ شعلہ و شبنم نہیں ہے

بہت وقفے ہیں دل کی دھڑکنوں میں

کسی سے رابطہ پیہم نہیں ہے

تو پھر کیوں چاک ہے گندم کا سینہ

جو زخم لغزشِ آدم نہیں ہے

رہا جم کر کسی کا عکسِ نازش

جنوں کا آئینہ مدھم نہیں ہے

ہمارے دل سے رنگِ غم نہ اُترا

ابھی زخم تو مرہم نہ اُترا

بہت تلخی سہی ناکامی کی لیکن

خمارِ کوششِ پیہم نہ اُترا

تحمّل نے بہت طوفاں کیے جذب

مگر دریائے شامِ غم نہ اُترا

بڑھی کچھ اور گُل کی تشنہ کامی

جگر میں قطرۂ شبنم نہ اُترا

نہ پہنچا طاقِ نسیاں تک کبھی ہاتھ

دوبارہ ہم سے جامِ جم نہ اُترا

ہوئی ظاہر نہ انساں کی حقیقت

لباسِ شادی و ماتم نہ اُترا

تصوّر اب حقیقت بن گیا ہے

تمہارا عکس تم سے کم نہ اُترا

سرایت کر گئی جب موت نازش

کسی تدبیر سے یہ سُم نہ اُترا

بیکار تھے نہ زیست کی راہِ دراز میں

چھانا سمندروں کو زمیں کے جہاز میں

ہم ہیں کہ ضبطِ کشف کے آئینہ دار ہیں

بے تاب ہو رہی ہے حقیقت مجاز میں

دل میرا اپنی حد میں ہے گردابِ سوز و ساز

دریائے نغمہ جوش پہ ہے تارِ ساز میں

میرے سفر سے راہزنوں میں ہے انتشار

ٹکڑے ہیں فاصلوں کے بھی راہِ دراز میں

نازشؔ رگوں سے پھوٹ رہی ہیں شکایتیں

گویا ہے رُوح بھی لبِ شکوہ طراز میں !

کرن روزن میں در آئی اُتر کر مہرِ تاباں سے

گلے ملتی ہے آزادی پلٹ کر اہلِ زنداں سے

کمی خودداریوں میں دیکھ کر جرأت ہوئی اس کو

ندامت ہنس رہی ہے سر اٹھا کر اب گریباں سے

یہ کس نے انگلیاں رکھ دی ہیں نبضِ امنِ عالم پر

صدائے بازگشت آنے لگی تارِ رگِ جاں سے

چلا ہوں اُن کے در سے بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر

فسانہ اب جُدا ہونے لگا ہے اپنے عنواں سے

سُخن گوئی کی شہرت سے میں رُسوا ہو گیا نازشؔ

مری ہی گرد یا لپٹی ہوئی ہے میرے داماں سے

شکستِ شوق کا احساس انگ انگ میں تھا

اک آئینے کی طرح میں دیارِ سنگ میں تھا

ہوا کی موج میں خوشبو ہوا کی موج بنی

اسیر پھول بھی اپنے سرابِ رنگ میں تھا

نکھر کے صبحِ گلستاں ہوا کے رُخ پہ چلی

اُبھر کے موسمِ گُل سیلِ آب و رنگ میں تھا

میں اپنے کرب کے گرداب کا اسیر رہا

زمانہ تیرتے لمحات کی ترنگ میں تھا

تمہارے ہاتھ میں آیا تو یوں لگا پتھر

کہ جیسے یہ کوئی نغمہ رنگیں رباب و چنگ میں تھا

سکونِ شوق وہ منزل نہاں جو گرد میں تھی

ہمارا عزم وہ لوہا جو اپنے زنگ میں تھا

کنارہ توڑ کے اُن تک پہنچ گیا آخر

مری غزل کا جو دریا حصارِ تنگ میں تھا

میں چُپ تھا کشمکشِ مرگ و زیست میں نازش

بڑے سکون کا ماحول جیسے جنگ میں تھا

غیر ممکن کہ دل سنبھل نہ سکے

وقت کیا موت ہے جو ٹل نہ سکے

ہم جو چاہیں تو تیرگی نہ مٹے

آپ چاہیں تو دھوپ ڈھل نہ سکے

عشق کا سوزِ ناتمام نہ پوچھ

لگ گئی آگ اور جل نہ سکے

قسمتوں کی سیاہیاں نہ گئیں

بستیوں میں چراغ جل نہ سکے

کیا وہ سمجھے نشاطِ غم نازش

جو مِرے ساتھ چل نہ سکے

میں سمجھا در پہ دستک اس نے دی ہے — یہ شاید آس دھوکہ دے رہی ہے

ترا جلوہ تو شاید دُور ہوگا ! — نظر حدِّ نظر تک دیکھتی ہے

خرد آئینہ تھی آبِ رواں تھی — اب اس پر کائیوں کی تہ جمی ہے

حسیں بھی ہے جواں بھی ہے یہ دُنیا — ہزاروں سال جو مجھ سے بڑی ہے

رواں دریائے بے پایاں ہے نازش

کنارا پھر بھی غرقِ تشنگی ہے

وقت کا گہرا سمندر آ بجو کیونکر ہوا

میرے طوفانی ارادوں کا لہو کیونکر ہوا

کہتے ہیں نظروں نے کچھ پھونکا ہے انکے کان میں

خامشی کا نام آخر گفتگو کیونکر ہوا

یہ تو دیکھو کس طرف پھیلا نہیں دامِ بہار

یہ نہ پوچھو میں خرابِ رنگ و بو کیونکر ہوا

مختلف دنیا کی راہیں تھیں، روش تھی مختلف

تیرا در سب کا جوابِ جستجو کیونکر ہوا

تم نے کیوں محسوس کر لیں میرے دل کی دھڑکنیں

میرا چپ رہنا حریفِ آرزو کیونکر ہوا

کس کی آنکھوں کے تصوّر میں تھا نازش غرقِ مے

میرا دل، بیگانۂ جام و سبو کیونکر ہوا!

کسی کے در پہ جاؤں کیا کشاکشِ ضمیر میں
گرفت کی ہیں قوتیں اس آتشیں لکیر میں

ہمارے دامنِ تہی نے سایہ ہم پہ کر لیا
سکوں سے محوِ خواب ہیں جہانِ دارو گیر میں

جو رقص کر کے مر گیا، سکوں سے آشنا ہوا
ہوائے سر دستی نہاں چراغِ شعلہ گیر میں

سحر کے آفتاب کی وہ نرمیاں کہاں گئیں
پرو لیا ہے اوس کو کرن کرن کے تیر میں

حدودِ گلستاں نہیں قیام گاہِ مستقل
خزاں بھی ہے بہار بھی لباسِ راہ گیر میں

کلاہِ فخر بن گیا سمٹ کے دامنِ طلب
یہ تمکنت کی بو کہاں سے آگئی فقیر میں

مزاجِ شعر مختلف ہے، پھر بھی نازشِ حزیں

وہ درد میرے دل میں ہے جو ہے کلامِ میر میں

ہر چند تم نے ہونٹ ہمارے سئے تو ہیں

لیکن ابھی نظر میں نئے زاویئے تو ہیں

ابھریں گے یہ اُفق پہ ابھی بن کے آفتاب

بجھتے ہوئے چراغ نے شعلے پیئے تو ہیں

کچھ دن رہی ہیں زد پشیمانیاں تری

کچھ دن تری نگاہ کے مارے جیئے تو ہیں

ملتی ہے کیا بلندیٔ فکر و نظر کی داد

دار و رسن کو چوم کے سجدے کیئے تو ہیں

موجیں لہو کی حدِ نظر میں رواں سہی

افسانۂ حیات میں کچھ حاشئے تو ہیں

تم سے بھی ہو سکا نہ اندھیروں کا سدِّ باب
تعمیرِ مہر و مہ کے دریچے کئے تو ہیں

نازش یہی نہ زخمِ شکستِ بہار ہوں
کچھ پھول مجھ کو اہلِ چمن نے دئے تو ہیں

دل اور اُس انجمنِ ناز میں تنہا ہو جائے
باغ میں پھول کھلے لالۂ صحرا ہو جائے

چاہیئے شمع کوئی تیرہ مقدّر کے لئے
وہ نظر بھر کے جو دیکھیں تو اُجالا ہو جائے

اے مرے جوشِ طلب کو نہ سمجھنے والے
تشنگی رُخ جو بدل لے ابھی دریا ہو جائے

عالمِ زیست کی بنیاد اندھیرے پہ نہیں

غم کی دیوار جو ہٹ جائے اجالا ہو جائے

اُف وہ جذبہ جو کبھی جوش میں اک لفظ بنے

ہائے وہ لفظ جو بربادِ تمنا ہو جائے

جام سے تا بہ دہن فاصلہ کچھ باقی ہے

کوئی آگاہ نہیں ہے کہ ابھی کیا ہو جائے

مرحلے زیست کے ہیں قابلِ عبرت نازش

ہر نفس درد بنے، درد تماشا ہو جائے

قابلِ فخر ہے عزت کا یہ ساماں میرا غیرتِ دل کی امانت ہے گریباں میرا

ہر ایک گام پہ پتھر، ہر ایک گام پہ خار

مرا سفر تو مسلسل خطاؤں جیسا ہے

خودی شناس غمِ روزگار میں ڈوبے

چٹان جیسے کسی آبشار میں ڈوبے

خزاں کی لہر نے لیں کروٹیں جو گلشن میں

تو پھول اپنے ہی رنگیں دیار میں ڈوبے

ہر ایک سطح پہ دیکھی گئی ہے گہرائی

جو لوگ نشّے سے ابھرے خمار میں ڈوبے

جو گیت وشت نوردوں کے لب سے گونجے تھے

چمن میں جا کے سرودِ بہار میں ڈوبے

ہے ایسی شبنمِ رفعت پسند میری حیات

جو ہو زمین پہ گم ریگ زار میں ڈوبے

حباب یوں تھے کنارے کی روشنی کی طرح

کہ ہم تلاطمِ صد اعتبار میں ڈوبے

جو دھڑکنوں کی طرح اس نے دل پہ دستک دی
تو فاصلے نگہِ انتظار میں ڈوبے

کرن کی طرح سفر اہلِ عزم کا دیکھا
رکے ہوا سے نہ موجِ غبار میں ڈوبے

بھرم کنارہ کشی کا رہا نہ کچھ نازش
گریز پا جنہیں کہتے تھے پیار میں ڈوبے

گردشِ دوراں ہمیں آواز دیتی ہی رہی
ہم چلے آئے تری محفل میں فرصت کے بغیر

یہ کس نے اڑائی کہ مجھے عشق ہے تم سے
ہاں تم کو یقیں آئے تو افواہ نہیں ہے

ہو صلیبِ غم تو کب تک کوئی بے قرار جاگے
وہ نصیب بن کے سوئے جو ستارہ وار جاگے

نہ ہو ایسی بیقراری کہ خلل پڑے سکوں میں
نہ ہو دل میں اتنی دھڑکن کہ ترا دیار جاگے

مری زندگی کا کوئی ہو ثبوت تو فراہم
ترے غم کی آنکھ جھپکے غمِ روزگار جاگے

ترا جاں فزا تبسّم ترا نغمہ گر تکلّم
کبھی لالہ زار چونکے، کبھی آبشار جاگے

مرا ذہن پھر ہے نازش کسی روشنی کا طالب
نئی موج کروٹیں لے مئے تابکار جاگے

زندگی تیری آرزو کے بغیر جس میں پانی نہیں وہ دریا ہے

تلاشِ منزل و سعئِ سفر سے دور ہوئے

نظر نظر سے ملی فاصلے عبور ہوئے

جہاں جہاں بھی پکارا مرے تخیّل نے

وہیں وہیں نئے حالات کے ظہور ہوئے

وہ کم نظر ہیں جو دیوانگی سمجھتے ہیں

جہانِ ہوش میں پیدا نئے شعور ہوئے

کسی کی پستئِ کردار زیرِ بحث نہیں

دنیا کی سطح پہ کچھ تجربے ضرور ہوئے

یہ اضطراب بھی نازش ہے آبرو کی دلیل

جو خاک و خوں میں نہائے وہ غرقِ نور ہوئے

غم جو پایا تو ہم خوشی میں ہنسے
اک کرن بن کے تیرگی میں ہنسے
کرب آمیز اک سکوں پایا،
دھوپ سے تلخ چاندنی میں ہنسے
چمک اُٹھا بہار کا دامن!
آپ جیسے کلی کلی میں ہنسے
یوں گزرتے ہیں واقعاتِ بہار
جس طرح کوئی اپنے جی میں ہنسے
کون ہے "گل سرشت" دنیا میں
کس کو فرصت کہ زندگی میں ہنسے
زخم دل کے لہو سے نکھرے ہیں
آگ کے پھول آگ ہی میں ہنسے

جو شگفتہ نہ ہو سکے نازش

وہ مضامین شاعری میں ہنسے

حادثے راہ میں ملتے رہے طوفاں کی طرح

ہم بھی چلتے رہے نبضِ غمِ دوراں کی طرح

برگِ لرزیدہ خبر دیتے ہیں طوفان سے قبل

ہر شجر راہ میں ملتا ہے نگہباں کی طرح

لب پہ آیا جو تبسم تو سزا بھی پائی !

لوگ ہیں پھول کے اجزائے پریشاں کی طرح

مسکراہٹ ہے تری آج بھی تشریح طلب

لفظ ملتے نہیں مجھ کو گُلِ خنداں کی طرح ،

ج تو کر ہی دیا وقت نے ہر راہ کو بند

اور اگر خیر سے فردا بھی ہو زنداں کی طرح

ندھیوں کے کبھی پہلے تو یہ انداز نہ تھے

اب تو دل اڑنے لگا گردِ بیاباں کی طرح

ی اُجالے میں لکھوں بیٹھ کے تاریخ بہار

خار آتے ہیں نظر شمعِ فروزاں کی طرح

ہم کہ ہیں آج اندھیروں کی فضا میں نازش

تھے اُجالوں کے امیں جشنِ چراغاں کی طرح

ڑھتا جو آگے اور بھی تھے منصبِ بلند

پستی سے اپنی رہ گیا منصور دار تک

زندگی جھوم اُٹھی آپ جدھر سے گذرے

مے کے بادل تھے کہ بے ساختہ برسے گذ

مطمئن ہوں ہیں تیرے سایۂ غم میں اے دوست

چاندنی شب ہو کہ سورج مرے سر سے گذ

سر بسر نغمۂ رنگیں ہمہ تن کیف و نشاط

دل کو چھوتے ہوئے کچھ عکس نظر سے گذر

زندگی آپ ہی افسانۂ رنگیں ہو جائے

تم سا عنواں جو کوئی میری نظر سے گذر

پھر چلے نقطۂ آغاز کی جانب نازش

کارواں شوق کے جب حدِّ سفر سے گزرے

چاندنی تقسیم کرنے کو جو اُٹھا ماہتاب

گوشۂ مغرب میں گُم سورج کی بھالی ہو

شباب کی لطافتیں بھی زار ہو کے رہ گئیں

بہار بن کے چھائی تھیں غبار ہو کے رہ گئیں

اس اعتماد سے مجھے ملی ہے دعوتِ جنوں

خرد کی مُسکراہٹیں نثار ہو کے رہ گئیں

وہ دن گئے کہ زندگی کی کروٹیں تھیں جاں فزا

اب احتجاج بن گئیں، پکار ہو کے رہ گئیں

اٹھی تھیں غم کی بدلیاں، چلی تھیں غم کی آندھیاں

مگر رخِ حیات کا نکھار ہو کے رہ گئیں

ہر انقلاب میں رہا وہ ضبط نازشِ حزیں

تباہیاں بھی غازۂ وقار ہو کے رہ گئیں

قابلِ دید جو صورت ہو کوئی تو، پوچھوں

سنگ بے نُور ہوئے آئینہ خانے کب سے

نئی ہے رات، نئی چاندنی ہے چھائی ہوئی

یہ چاندنی ہے مگر دھوپ میں نہائی ہوئی

ملے ہیں آنکھوں کو آنسو دلوں کو سِکّۂ زخم

تمہارے دَور میں کتنی بڑی کمائی ہوئی

چلو کہ گردشِ ایام میں ذرا ہنس لیں

رواروی میں یہ فرصت بھی ہے چرائی ہوئی

مزاجِ حُسن پہ یہ بار ہے مگر نازش!

اک آرزو ہے ہمیشہ سے مسکرائی ہوئی

ہو جو سقراط کی جرأت تو حقائق کا نچوڑ

زہر کا ایک پیالہ نظر آتا ہے مجھے

کون گزرا تھا بہاروں میں کہ ہر پیکرِ گُل

حسنِ رفتار کا ٹکڑا نظر آتا ہے مجھے

لمحہ لمحہ زیست کا اک دن غم ہی غم بن جائیگا

نقرئی نغمہ کانپ اُٹھے گا اور ماتم بن جائے گا

رفتہ رفتہ ایک حقیقت افسانہ ہو جائے گی

رفتہ رفتہ ایک افسانہ سب کا غم بن جائیگا

الجھن اہلِ دل کی حسیں ہے اور حسیں بن جائیگی

صبح و شام کا دائرہ جس دن زلف کا خم بن جائیگا

صبر و وفا۔ امید و خوشی مایوسی میں ڈھل جائینگے

کتنے عالم ہونگے جن سے اک عالم بن جائے گا

لمحے کبھی انگڑائی لیکر اُڑ جائینگے اے نازش!

گھٹتے گھٹتے وقت کا دھارا ابھی شبنم بنجائیگا

سنگباری نہ کرو ہاتھ کی توہین ہے یہ

پتھروں ہی سے بنی تاج محل کی صورت

ارماں کچھ اور شہرِ تمنّا میں بس گئے

دریائے بے کنار پہ بادل برس گئے

کوتاہیِ عمل پہ رہا، جن کا انحصار

اک بار شاخِ گل سے اڑے تا قفس گئے

آکر قریب کتنی بہاریں گزر گئیں

گلزار کتنے بارشِ گل کو ترس گئے

شاداب گل کی طرح تھے غم کے حصار میں

خطِّ پناہ سے جو بڑھے ہم جھلس گئے

غم کے مقابلے کی سکت مجھ میں دیکھ کر

زنجیرِ حادثات کو وہ اور کس گئے

مایوسیوں کا زہر تھا ارزاں مرے لئے

حالاتِ حاضرہ مری قسمت کو ڈس گئے

جب میں شعورِ دید سے بیگانہ ہو گیا

میری نظر کو لاکھ مناظر ترس گئے

شہرِ وفا کو آگ کے شعلوں میں دیکھ کر

کچھ لوگ انتقام کے جنگل میں بس گئے

نازش جو تجربات کی پھیلی ہے روشنی

شمعیں جلا جلا کے مرے ہم نفس گئے

ہر نفس کے ساتھ دل کی سطح پر آتے رہے

کتنے مشکل زاویوں سے تم نظر آتے رہے

دل کو نقادوں نے اک نازک حقیقت کر دیا

شیشہ گر آتے رہے آئینہ گر آتے رہے

خالی خالی سا نظر آتا ہے بازارِ افق

رات بھر جیسے خریدارِ سحر آتے رہے

تھا پسِ ترکِ تعلّق بھی رگوں میں خونِ گرم
دور تک یہ آگ کے شعلے نظر آتے رہے

نازشؔ ایسے پھول بھی کھلتے رہے گلزار میں
بن کے جو پیغمبرِ برق و شرر آتے رہے

سمجھا لہو کو رنگ کی برسات کون کون
پہچانتا ہے صورتِ حالات کون کون

دیکھی ہیں تیرے شہر کی مہماں نوازیاں
لیکر چلا ہے درد کی سوغات کون کون

کس کس کا ہے قیام سفر میں رچا ہوا
بیٹھا ہے لے کے دشتِ خیالات کون کون

چراغِ شامِ تسکیں گر گیا کیوں نہیں تقدیر کے ہاتھوں میں د

اس دور میں ہے سب کی جسارت کا امتحاں

کھولیگا اب دریچۂ جذبات کون کون

پگھلی ہوئی سی دھوپ ہے بہتا ہوا غبار

سمجھے گا یہ نزاکتِ لمحات کون کون

اے ساکنانِ خیمۂ مہتاب یہ بتاؤ

دیکھے گا میری درد بھری رات کون کون

نازش فضا میں گونج رہا ہے جنوں کا راز

کیا جانے لے اڑا ہے مری بات کون کون

آجتک گندم کا سینہ چاک ہے افسوس میں

عمر بھر کی تو سزائے حضرتِ آدم نہیں

ہے مرے دل کا صحیفہ آج بھی اپنی جگہ

بارشِ غم ہے مسلسل اور کاغذ نم نہیں

میری نگاہ تیر رہی ہے شراب میں	ذرّے کا ہے سفینہ رواں آفتاب میں

آخر کسی کی دید کا الزام مجھ پہ کیوں	تھا مجھکو ہوشِ جرم کہاں ارتکاب میں

اس دائرے کو توڑ نہیں سکتی کوئی موج	پانی کی تشنگی کا خلا ہے حباب میں

توفیق ہو اگر تو یہ اوراق کر دیں چاک	اک بابِ مرگ بھی ہے ہماری کتاب میں

تعمیر کیجئے اپنے لئے اک جہانِ نو	ہیں سنگ و خشت مملکتِ ماہتاب میں

تا عمر زندگی کی حقیقت رہے عیاں	لمحات کے قدم تو جمیں میرے خواب میں

دریا بھی اک فریب ہے، ساحل بھی اک فریب	خیمے حباب کے نظر آئے سراب میں

نظروں کا التفات تغافل میں ڈھل گیا	کرنیں پلٹ کے ڈوب گئیں آفتاب میں

نازش نظر تھی انکی طرف ایک سطح پر!

داخل ثواب میں ہوں نہ شامل عذاب میں

ہر طرف گورات کا بکھرا ہوا شیرازہ تھا

بند مجھ پر تو نمودِ صبح کا دروازہ تھا

قدر کر موجِ ہوا ذرات کو تارے بنا

یہ غبار اک دن رُخِ دیوانگاں کا غازہ تھا

ننھی کلیاں سر گریباں ہیں دبے تھیں سہم گئیں

طعنے بوندوں کے تھے، بادل کا کرخت آوازہ تھا

وہ نظر آتے رہے ہم کو غموں کے پار بھی !

دل ہمارا جیسے شیشے کا کوئی دروازہ تھا

ہائے نازش دم زدن میں ہاتھ خالی ہو گیا

بند تھی مٹھی تو یکجا غنچے کا شیرازہ تھا

غمِ حیات کی مظہر ہیں جو زمانے میں

بدل گئی ہیں وہ قدریں مرے فسانے میں

رہِ طلب میں جہاں سخت مرحلے آئے

حیات رہ گئی مجھ سے قدم ملانے میں

یہ دَور وہ ہے کہ ساغر تو سب کو ملتا ہے

جوازِ مے نہیں، لیکن شراب خانے میں

تڑپ کے جیسے ٹھہر جائیں برق کی لہریں

یہ کس مزاج کے تنکے ہیں آشیانے میں،

ازل کے دن سے ہے الزام زندگی میں اسیرؔ

وہ ایک سانس جو آنے میں ہے نہ جانے میں

زبانِ شوق پہ یہ کس کے گیت ہیں نازشؔ

شمیمِ گل کی مہک ہے مرے ترانے میں

ـواں ہے انجمن میں غمزدہ اہلِ نظر اُٹھے

چراغوں سے کہاں تک اپنی لَو کا بارِ سَر اُٹھے

ـیوں کے مقدر کا سنورنا اس کو کہتے ہیں

گرے دو چار گھر جب شہر میں دس بیس گھر اٹھے

ـوں نے بہت پیشِ نظر راہیں بچھائی ہیں

قدم آوارگیٔ شوق میں دیکھیں کدھر اُٹھے

ـیں آپس کی چشمک منزلِ مقصد نہ گم کر دے

مسافر ایک اُٹھا اور ہزاروں راہ بَر اُٹھے

ہزاروں منزلیں طے کر گئے اہلِ سفر نازش

مگر ہم منتظر ہیں بسترِ شب سے سحر اُٹھے

———————

غموں کا ذکر ہی کیا زیست کے فسانوں میں
یہ جھوٹے سکوں کی جھنکار ہے خزانوں میں

ہمارے دل میں جسارت کے زاویے پاکر
پہنچ کے تیر پلیٹ جائیں گے کمانوں میں

نکل کے شورشِ دنیا سے کیجے عزمِ سفر
فراغتوں کی زمینیں ہیں آسمانوں میں

کہیں کہیں ہے بہت تلخ داستانِ حیات
حقیقتوں کے بھی پیوند ہیں فسانوں میں

وہ اب بھی راہ میں دیتے ہیں روشنی ہم کو
جلے چراغ جو گزرے ہوئے زمانوں میں

جو زندگی ہے کمی دشمنوں کی کیا نازش!

غمِ حیات بھی ہے میرے میزبانوں میں

ق کی انجمن میں وہ مائلِ التفات ہے

میرے جہانِ یاس میں آج ہی چاند رات ہے

کسی نے اک نیا صفحۂ غم الٹ دیا

میری تمام زندگی دفترِ مشکلات ہے

ے طرف تجلیّاں پردۂ حُسن بن گئیں

ایک طرف نقاب کا نام "تجلیات" ہے

تو ٹھہر گیا کہیں نبضِ حیات رُک گئی

تیرے قدم کے ساتھ ساتھ وجد میں کائنات ہے

یوں تو جہاں میں نام ہے نازشِ خوش کلام کا

تیری نظر کی بات پھر تیری نظر کی بات ہے

قدم آجکل چومتے ہیں جو رستے مرے شوق کی شاہراہوں سے کم ہ

ہیں جن مرحلوں میں سفر کر رہا ہوں تری عزم افزا نگاہوں سے کم ہ

ہواؤں کے رخ کا پلٹنا ہی کیا ہے ذرا دیر میں کچھ کا کچھ ہو رہے گ

حوادث میں پھیلاؤ کی بھی سکت ہے ابھی دیکھنے میں پناہوں سے کم ہ

یہ ڈر ہے کہیں رنگ کروٹ نہ بدلے کہیں، منجمد آگ لو دے نہ اٹ

گلوں کے نفس جتنے مہکے ہوئے ہیں، نسیمِ گلستاں کی آہوں سے کم

خود اپنی وفا کا پجاری ہوں اب تک مری بندگی کا غرور اللہ ا

ترے ناز کے بت کدے جس قدر ہیں مرے شوق کی سجدہ گاہوں سے کم

مسلّم مشیت کی ہر بات نازش، مگر پھر اسے سوچنا ہی پڑے

گناہوں کی تحریک حد سے زیادہ، سزا کے جہنم گناہوں سے کم

تم دل ہی مکیں ہو مجھے نظروں میں تو رکھو

کمرے ہیں رہو شوق سے دالان تو د

کیف محدود ہے جب پھول کے پیمانے تک
ہم بھی اب آنکھ نہ کھولیں گے بہار آنے تک

آخری دور میں وہ دُردِ تہِ جام ہوا
صورتیں غم کی بدلتی رہیں، پیمانے تک

عشق کے بعد ہے ہر علم کا دامن خالی
ختم الفاظ و معانی مرے افسانے تک

خلد کا رقبہ محفوظ جسے کہتے ہیں،
جام تا جام ہے پیمانے سے پیمانے تک

گردشیں راہ میں دم توڑ رہی ہیں نازش
غمِ دوراں کی رسائی نہیں میخانے تک

اب تک کہیں آثار نہیں بخیہ گری کے
لمحوں میں پرخچے اڑے جاتے ہیں صدی کے

آئی جو زباں پر کبھی منزل کی تمنا
آسیب نظر آئے بہت راہ بری کے

ہیں غم کے سمندر میں سکوں کے بھی جزیرے
جگنو ہیں جبینِ شبِ تاریک کے ٹیکے

ساقی تجھے موقع تو ملا خیر و عمل کا
جاری ہیں ابھی فیض مری تشنہ لبی کے

کرنا ہے نگاہوں سے مجھے تجزیہ اے دوست
کچھ پھول بہاروں کے ہیں کچھ پھول ہنسی کے

دن رات انہیں عکس کی ملتی ہے بہت بھیک
یہ آئینے کاسے تو ہیں دریوزہ گری کے

تاریکیٔ شب پائی اجالے میں بھی نازش
الزام وطن میں ہیں غریب الوطنی کے

لیا ہے کام بہت ضبط کے ذخیروں سے

شکست دیتے ہیں طوفاں کو ہم جزیروں سے

دیارِ دل کا سُنایا ہے حال اشکوں نے

ملی ہے عافیت اپنی انہی سفیروں سے

ہمارے زیرِ قدم ہے ہر ایک منزلِ شوق

بچے گا راستہ کوئی نہ راہ گیروں سے

انہی سے ابھرے گی اک روز عزم کی تصویر

جبینِ شوق مزیّن ہے جن لکیروں سے

بلند ہونے لگے حوصلے اندھیروں کے

یہ چھین لیں نہ کہیں روشنی ضمیروں سے

کرے نہ کوئی امیدوں کا تجزیہ نازشؔ

ہزاروں نقطے نکل آئینگے لکیروں سے

اسے کون تازگی دے مرے دل کی جو کلی ہے

یہ ہوا نئی نئی ہے، یہ بہار اجنبی ہے

یہ ہماری جنبشِ لب بڑی دور تک گئی ہے

کسی اہلِ دل سے پوچھو کہ یہ کونسی ہنسی ہے

کبھی سانس میں مہک ہے کبھی شورشِ تلاطم

مرے دل کی دھڑکنوں سے تری یاد کھیلتی ہے

اِدھر اک اداس منظر، اُدھر آبشارِ زرّیں

مری صبح کے علاوہ کوئی صبح اور بھی ہے

اثر آفریں نہیں ہے جو مری نیازمندی

مرے کعبۂ وفا میں کوئی سنگِ آذری ہے

مری ناؤ وہ تلاطم کہ بدل دیتے ہیں دھارے

جو ابھر کے بڑھ رہی تھی وہی لہر گر پڑی ہے

ہر چیز حسین و رنگیں تھی ہر ذرّہ یہاں تابندہ تھا

تھی اپنی جوانی پر دنیا دل میرا جب تک زندہ تھا

محروم ملاقات اس سے رہے نزدیک نہیں تھا جو خود سے

ہم جس کو اپنا کہہ نہ سکے شہرِ دل کا باشندہ تھا

کچھ مجھ سے زمانہ پا نہ سکا میں اس کے کسی کام آ نہ سکا

دنیا مجھ سے شرمندہ رہی دنیا سے میں شرمندہ تھا

ایک ایک قدم دیتا تھا خبر پاؤ گے سکوں مستقبل میں

جب حال نے ماضی کو بدلا مستقبل پھر آئندہ تھا

ایسے میں بلا لاتا کوئی آفاق کی گردش کو ساقی

ہر جرعۂ صہبا وجد میں تھا ہر پیمانہ رقصندہ تھا

ملتا جو اُسے ویرانے میں تو لالۂ صحرائی ملتا

صحرا کی ہوا کا ہر جھونکا صحرا میں کیا جوئندہ تھا

تھا دورِ محبت کیف آور، ہر سانس تھا موجِ مے نازش
ہر آہ ڈھلی موسیقی میں، جو حادثہ تھا سازِ ندہ تھا

کسی پر اثر جذبِ دل کا ہوا ہے، کسی نے سنیں آنسوؤں کی صدائیں
تکلّم کے انداز پیدا کئے ہیں سکوتِ محبّت کے قربان جائیں
مرا دل جو ٹوٹا تو ٹوٹا بلا سے مگر بانکپن پھول سے کم نہیں ہے
شکستِ وفا کا یہ دلچسپ منظر، چلو آج جشنِ تباہی منائیں
ملے کچھ ثبوت اپنی دریا دلی کا خدائی کا دیں حوصلہ ناخدا کو
اُسی لہر کا نام رکھ دیں کنارا کہ جس لہر پر کشتیاں ڈگمگائیں
کہاں تک ہو تاریکیوں کا مداوا کہ ہم تو پشیمانِ تقدیر ٹھہرے
نمودِ سحر کا بھروسہ نہیں ہے کہاں تک چراغ آنسوؤں کے جلائیں
گدایانِ شاہنشہی کم نہیں ہیں مقدّر سے لیکن ہیں مجبور نازش
بڑے حوصلے اہلِ فریاد کے ہیں، یہ محلوں کی پستی یہ اونچی صدائیں

جب تصور کی نظر سے بارِ پس منظر اُٹھے

حال کی محفل میں ماضی آئینہ بن کر اُٹھے

ایک ساحل کا سکوں ہے اس کے دل کا مدّعا

لاکھ آغوشِ تلاطم میں کوئی پل کر اُٹھے

کچھ نہ کچھ دیوانگی کی داد ملنا چاہیئے

پھول برسا دے نہ جس کے ہاتھ سے پتھر اٹھے

تاب اٹھنے بیٹھنے کی مجھ میں جب باقی نہ تھی

آپ کی محفل میں پیمانے چلے، ساغر اُٹھے

رہ کے ساکت انجمن میں طے کیا ہم نے سفر

ہوش میں بیٹھے تھے لیکن ہوش سے باہر اُٹھے

وہ جو آئیں بھی تو ہم کیا ڈال سکتے ہیں نگاہ

بار سائے کا نہ جب سورج سے ذرّہ بھر اُٹھے

سوتے سوتے ہم نے نازشؔ اپنی منزل کی ہے طے

نیند فرشِ خاک پر آئی سرِ محشر اُٹھے

وہ دُور سے آواز یہ دیتے ہیں" سنبھل کر

ہنستا ہوں میں حالات کی تلوار پہ چل کر

ہے جاں کی رمق میری تمنائے حسیں میں

دل کہتا ہے۔ تعمیر کوئی تاج محل کر

اُٹھ میری طرح چرخ کی گہرائی کو چھو لے

مہتاب کی کشتی نے کہا تہ سے اچھل کر

ہر روز کمی دورِ خوشی میں ہے گوارا

رہ جاتا ہے مہتاب بھی تھوڑا سا پگھل کر

ہے عزم مرا قطرۂ بارانِ گہر خیز

جو تہ میں اُترتا ہے بلندی سے پھسل کر

سورج میں شگاف آئیں نظر جیسے اچانک

پھیلے ہیں اندھیرے بھی اُجالوں سے نکل کر

نازش میں حرارت ہوں نہ سورج کی کرن ہوں

گلشن پہ برس پڑتی ہے جو اوس سے جل کر

منتظر مہماں نوازی کے لئے ہے گھر مرا

گردشِ دوراں بھی آ کر ڈھونڈتی ہے در مرا

ہو کسی کا غم مری بادہ کشی غم خوار ہے

پھٹ گئے بادل، شکستہ ہو گیا ساغر مرا

شوقِ منزل میں اُٹھاتا ہوں قدم میں تیز تیز

اور سنگِ راہ آتا ہے نظر رہبر مرا

اپنے دل میں غم کو یوں آرام پہنچاتا ہوں میں

بار اُٹھا لیتا ہے جیسے جسم کا بستر مرا

اور کی منّت کشی خودداریٔ دل کیوں کرے

خود پہ ہنس لیتا ہوں یہ احسان ہے مجھ پر مرا

اس اجالے میں چلے آتے ہیں نا آشنا نثار

روشنی مقتل میں کرتا ہے چراغ سر مرا

ہوا کی لہر میں جتنا حسین ترنم تھا

حدودِ زہرہ و ناہید میں کہیں گم تھا

نہیں تھی میکدے میں میکشوں کی گنجائش

کہیں تھے شیشے کہیں جام تھے کہیں خُم تھا

زمین پر مری پرچھائیں دیکھنے والو

وہ میں نہیں تھا مرا سایہ تو ہمّ تھا

وہ کیوں نحیف سی اک موج کا شکار نہ ہو

نگاہ جس کی سمندر کے آر پار نہ ہو

کبھی سُنوں نہ پڑھوں دل کے ٹوٹنے کی خبر

جو حادثہ ہو کبھی حادثہ نگار نہ ہو

تمہارے پاؤں کی میں چاپ روز سُنتا ہوں

یہ میری گزری ہوئی عمر کی پکار نہ ہو

تمام عمر گزر جائے ایک لمحے میں

تمام عمر کسی کا جو انتظار نہ ہو

ہر ایک شخص کرے تم کو اجنبی محسوس

جو اپنے شعر سے نازشؔ تم آشکار نہ ہو

○

تری یاد مستقل ہے، ترا نقش جاوداں ہے

سرِ ریگزار اب بھی کسی لہر کا نشاں ہے

تری بے توجہی تک ہیں دھڑکتے دل کے جذبے

جسے ریت جذب کر لے یہ وہ چشمۂ رواں ہے

نہ امید کی تپش ہے، نہ امید کا اجالا

یہ بجھا بجھا سا سورج مری صبح کا نشاں ہے

جنہیں قدرِ گل نہیں تھی وہی بوئے گل سے مہکے

نہ حصارِ گلستاں ہے نہ وقارِ گلستاں ہے

رہِ آرزو میں نازش مرا دل ہے وہ مسافر

جو کہیں رُکے تو منزل جو چلے تو کارواں ہے

○

بس کام کی ہے چیز تصوّر جمال کا

باقی ہر ایک شے ہے کھلونا خیال کا

کام آسکی نہ ایک بھی دیوار ضبط کی

گزرا ہے دل کو توڑ کے دریا ملال کا

امید یوں کہ جیسے ہوا میں کوئی چراغ

مستقبل اک فریب سا ہے دورِ حال کا

رک جاؤ کس میں تو تھکے ابھی کاروانِ وقت

ہے میرے ساتھ ساتھ سفر ماہ و سال کا

نازش وہ کیا چھپیں گے مرے شوق دید سے

موجود ہر جگہ ہے فرشتہ خیال کا

گلزار ہے ترجمان کس کا
ہر پھول پہ ہے گماں کس کا

ہر لمحہ تڑپ کے جل دیا ہے
کرتا تھا یہ امتحان کس کا

ہر رات کو جاگتے ہیں تارے
ہے منتظر آسمان کس کا

ہے آبِ رواں کا پردہ جس پر
آنکھوں میں ہے یہ مکان کس کا

ہر شخص وقار کھو چکا ہے
اب وقت ہو قدردان کس کا

یہ کشتِ وفا یہ ان کی تعریف
کس کی ہے زمین لگان کس کا

ساکت ہے زبان دھڑکنوں کی
دل ہو گیا رازدان کس کا

تم آئینہ مجھ کو کہہ رہے ہو
مجھ پر یہ ہوا گمان کس کا

کہتے ہیں زمین سب کی ماں ہے
پردہ ہے یہ آسمان کس کا

ہر ایک نگاہ میں ہے نازش
اب پاس کرے زبان کس کا

○

تیرے جلوے نے مجھ کو اپنایا

دھوپ میں جذب ہو گیا سایا

ان کی نظروں کا اک حسیں بادل

دل کے پیمانے میں اتر آیا،

ایک دیوارِ رنگ و بو بنکر

تم نے میرے قدم کو ٹھہرایا

لیجیے پھولوں کا جائزہ پھر سے

کس دریچے میں وہ نظر آیا

تتلیاں آنسوؤں کی بکھری ہیں

جب تمنّا کا پھول کمھلایا

ہم نے ایک ایک غم کو سمجھا ہے

زیست کا بہترین سرمایا

خالقِ کائنات کو نازش

غم کی تخلیق میں مزا آیا،

○

ماحول کے سکوت سے اکتا رہے ہیں لوگ

پھر کوئی حادثہ ہو کہ گھبرا رہے ہیں لوگ

شاداب ہیں کہ غم کی ہوا کھا رہے ہیں لوگ

شعلوں میں رہ کے پھول بنے جا رہے ہیں لوگ

گھبرا کے دے دیا ہے ستاروں نے راستہ

حکمت سے آسماں کی طرف جا رہے ہیں لوگ

ٹوٹی ہیں آج شیوۂ تسلیم کی حدیں

ہنس ہنس کے حادثات سے ٹکرا رہے ہیں لوگ

افسردہ و ملول سے چہروں کے باوجود!
گلزارِ کائنات کو مہکا رہے ہیں لوگ

ہوتی ہے ہمکلام فضائے خموش بھی
فطرت کے ہر غرور کو لچکا رہے ہیں لوگ

یہ چلتے پھرتے عکس ہیں کچھ دیر کے لئے
فطرت کے آئینے میں نظر آرہے ہیں لوگ

کیا غم، رہِ طلب میں جو سر پہ ہے آفتاب
قدموں میں اپنا سایہ لئے جارہے ہیں لوگ

امید کے چراغ بھی نازش بھڑک اٹھے
کرنوں کی آرزو میں دھواں پارہے ہیں لوگ

○

خزاں سے ہارنا عادت ہے یہ گلہائے خنداں کی

ہمیشہ پھول ہی توہین کرتے ہیں گلستاں کی

دھڑکتے دل سے گردش خون کی ملتی ہے ذرّوں کو

گزرتے قافلوں سے نبض چلتی ہے بیاباں کی

ابھی تہذیب کی قدروں سے ہیں کچھ لوگ ناواقف

ابھی ذہنوں میں ہیں پرچھائیاں چاکِ گریباں کی

کہیں سمتِ کو تمہاری عافیت کوشی نہ لے ڈوبے

کنارا ابھی ہے اک ٹوٹی ہوئی انگڑائی طوفاں کی

اسیرانِ ستم کے حوصلے بڑھتے گئے نازش

اسی رفتار سے گرتی رہی دیوارِ زنداں کی

یہ کس ہوا میں اڑا رہی ہیں شگوفہ و برگِ تر کی باتیں
شگوفہ و برگِ تر کی باتیں کہ ہیں مرے بال و پر کی باتیں

امید موہوم پر ہیں قائم عروجِ ذہنی کے چند خاکے
عروجِ ذہنی کے چند خاکے، کہیں فروغِ نظر کی باتیں

نقاب اٹھانے کی التجائیں خودی کی توہین کر رہی ہیں
خودی کی توہین کر رہی ہیں نگاہِ دریوزہ گر کی باتیں

بڑا ہمہ گیر تبصرہ ہے نگاہِ آخر کی ایک لغزش
نگاہِ آخر کی ایک لغزش سنا گئی عمر بھر کی باتیں

کہاں یہ تیرہ نصیب نازش کہاں طلوعِ سحر کا قصہ
کہاں طلوعِ سحر کا قصہ کہاں چراغِ سحر کی باتیں

ایک لمحے کے لئے عمرِ گریزاں نہ رکی   وقت نے وقت نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

دستِ ساقی میں رہا جب تک تو آب سادہ تھا

ہونٹ تک میرے جہاں پہنچا تو ساغر زادہ تھا

رات کی آنکھوں میں تھا روشن ستارے کی طرح

صبح کو دیکھا تو قطرہ اوس کا افتادہ تھا

رات دن دریا کی صورت کوئی چلتا میرے ساتھ

صبح سے شب تک سفر کرنے کو جو آمادہ تھا

کس طرح اٹھتے قدم۔ تھا دام میرے پاؤں میں

منزلیں ناپید تھیں لپٹا ہوا سا جادہ تھا

پھول یکساں ہی سہی نازش مگر تھا امتیاز

کوئی گلشن زادہ تھا کوئی بیاباں زادہ تھا

مدت کے بعد صبح کا امکاں ہے آجکل

لیکن حیات خواب پریشاں ہے آجکل

برعکس کیتی گردشِ دوراں ہے آجکل

بیتے دنوں کے ہاتھ میں داماں ہے آجکل

ہم خاک بن کے کیوں نہ بکھر جائیں ہر طرف

سنتے ہیں دشت اور بھی ویراں ہے آجکل

حیراں ہیں تیرے ضبطِ تبسّم پہ دیدہ ور

پنہاں اسی گرہ میں گلستاں ہے آجکل

نکلے نہیں حصار سے باہر مرے قدم

شہرِ خیال صورتِ زنداں ہے آجکل

اس دورِ ناشناس کی رفتار تیز ہے

سقراط خود ہی زہر کا خواہاں ہے آجکل

وہ خاک جس سے تھا کبھی صحرا کا امتیاز

آنکھوں کی بستیوں میں پرافشاں ہے آجکل

جیسے اندھیری رات میں ہو لَو چراغ کی

آنکھوں میں یوں نظر تری رقصاں ہے آجکل

نازش گزر رہا ہے غموں کے پہاڑ سے

تیشہ بکف ہے اور غزلخواں ہے آجکل

چل اے ذوقِ تجسّس دیکھ لیں حدِّ نظر کیا ہے

اِدھر تو دیر و کعبہ سے ہے ہنگامہ اُدھر کیا ہے

کوئی سمجھے طلب کی آبرو، ہر گام پر کیا ہے

رُخِ منزل کا غازہ ہے مری گردِ سفر کیا ہے

چراغِ ماہ و انجم بجھ گئے قسمت نہیں جاگی

خدا جانے یہ تاریکی بعنوانِ سحر کیا ہے

گراں ہوتی ہے شبنم پھول کی پتّی پہ دیوانے

یہ تیرا آسرا نازک سی اک امّید پر کیا ہے

میں جتنا بڑھ رہا ہوں ٹوٹتی جاتی ہیں زنجیریں

بڑی نعمت ہے یہ آزادیٔ فکر و نظر کیا ہے

جہاں کھلتے ہیں بازوئے شاخِ گل لیتی ہے انگڑائی

چمن کی زندگی ہے میری سعیٔ بال و پر کیا ہے

نہ ہو امید ہی دل میں تو دل کی موت ہے نازش

چراغ اک رات بھی جس میں نہ روشن ہو وہ گھر کیا ہے

یہ عشق ہیں وفارِ نظر دیکھتا ہوں میں

جلوے پکارتے ہیں جدھر دیکھتا ہوں میں

جذب دل و مقامِ نظر دیکھتا ہوں میں

تو پردہ اختیار تو کر دیکھتا ہوں میں

تیرہ نصیبیوں پہ مری جا نہ اے ندیم

اس ہونٹ پر دلیلِ سحر دیکھتا ہوں میں

آئینہ ہوں کہ آئینہ گر۔ یہ بھی راز ہے

وہ مجھ کو دیکھتے ہیں جدھر دیکھتا ہوں میں

پردے کی ہر شکن کہیں پردہ شکن نہ ہو

گھر سے کچھ نشانِ نظر دیکھتا ہوں میں

کیا بات تھی کہ وہ بھی رہے جس سے بے قرار

آئینہ لاؤ، اپنی نظر دیکھتا ہوں میں

نازکشِ نہ دیکھنے پہ اٹھا کرتے ہیں حجاب

رہتے ہیں راز راز اگر دیکھتا ہوں میں

چمکیں گے اپنے جشنِ چراغاں سے ایک دن

ہم جل اٹھیں گے آتشِ پنہاں سے ایک دن

تکمیلِ آرزو کے یہ ساماں عطا ہوئے

صحرا سے ایک رات گلستاں سے ایک دن

ہر شمعِ شب گزیدہ تھی بزمِ حیات میں

جھانکا جو ہم نے اپنے شبستاں سے ایک دن

جذبات سے بجھائیں گے آنکھوں کی تشنگی

لہریں سمیٹ لائیں گے طوفاں سے ایک دن

مانگی ہوئی بہار دو روزہ ہے زندگی

یہ جا ملے گی اپنے گلستاں سے ایک دن

جاتے ہیں بوئے گل کی طرح ہم چمن سے آج

آئیں گے خاک بن کے بیاباں سے ایک دن

نازش وہی ہیں نقشِ قدم اب بہار کے

جو پھول ہو چلے تھے نمایاں سے ایک دن

کوئی بھی ترے شہر میں غم خوار نہیں ہے

اشجار تو ہیں سایۂ اشجار نہیں ہے

راز اس کا کوئی خاک نشینوں سے تو پوچھے

لہجہ ترا پندار ہی پندار نہیں ہے

اب بھی تری یاد آئی بڑے پیار سے لیکن

خوشبو کی طرح نرمیٔ رفتار نہیں ہے

دل ہو نہیں سکتا کبھی تدبیر کا قائل

جو وقت کو روکے یہ وہ دیوار نہیں ہے

وہ مہرِ جہانتاب سے محروم ہے نازشؔ

جس دور کی تقدیر میں فنکار نہیں ہے

زباں تھی ضبط کی خوگر ترے آنے پہ کیا گزری

جواب تک نا شنیدہ تھا اُس افسانے پہ کیا گذری

ہمیں یاد آیا قصّہ، خلد سے اِخراجِ آدم کا

گرا جب دستِ ساقی سے تو پیمانے پہ کیا گزری

خراشوں نے لکھی روداد غم کی صفحۂ دل پر

بہت تھے زخم خوردہ لفظ افسانوں پہ کیا گزری

شجر اپنی جگہ پھل پھول لے کر لہلہاتے ہیں

مگر مِٹّی میں مل کر بے ضرر دانے پہ کیا گزری

کہانی زندگی کی کہتے کہتے سو گیا نازشؔ

قیامت میں کھُلے گا اپنے بیگانے پہ کیا گزری

اُسے کون تازگی دے مرے دل کی جو کلی ہے
یہ ہوا نئی نئی ہے یہ بہار اجنبی ہے
یہ ہماری جنبشِ لب بڑی دُور تک گئی ہے
کسی اہلِ دِل سے پوچھو کہ یہ کونسی ہنسی ہے
اِدھر اک اُداس منظر اُدھر آبشارِ زرّیں
مری صبح کے علاوہ کوئی صبح اور بھی ہے
اثر آفریں نہیں ہے جو مری نیاز مندی
مرے کعبۂ وفا میں کوئی سنگِ آذری ہے
کوئی داغِ بدنما ہوں میں کتابِ زندگی میں
وہ شکستہ سا ورق ہوں جسے آگ چھو گئی ہے
کوئی دے صدا اُفق کو، کوئی مہر کو پکارے
کوئی آگ ہی لگا دے کہ سحر بجھی بجھی ہے
وُہی دَورِ مستقل ہے مرے شہرِ غم میں نازش
نہ کہیں اُٹھے ہیں بادل نہ کبھی ہوا چلی ہے

دروازہ مرے دِل کا کوئی کھول گیا ہے

شاید تیرے مہکے ہوئے ہاتھوں نے چھوا ہے

دامن پہ پڑے گردِ مسرّت تو جھٹک دیں

ملبوس ہمارا غمِ دوراں کی قبا ہے

بخشی غمِ دوراں نے مجھے شدّتِ احساس

دھڑکا ہے مرا دل کہیں پتا جو ہلا ہے

ہر شخص ہے آغوش تلاطم کا طلب گار

یہ کون مجھے وقت کے دھارے پہ ملا ہے

برباد ہوئے سینکڑوں توبہ کے تقدّس

جب جا کے کہیں میکدہ آباد ہوا ہے

نازش میں ہر اک لمحے کو کرتا ہوں اجاگر

ہر شعر مرا وقت کے ماتھے پہ لکھا ہے

گھٹنیوں چل کے مہ و سال گزر جاتے ہیں
پھر کہیں ہم کو جواں لمحے نظر آتے ہیں

مسکراتی ہوئی نظریں ہیں چمن میں کس کی
نخل پر ہنستے ہوئے برگ و ثمر آتے ہیں

پردہ پوشی کو تری، وقت کے خادم ہر وقت
چادرِ شام و سحر لے کے اُتر آتے ہیں

راہ میں میری خوشی خار بچھا دیتی ہے
غم کے لمحات، کبھی آتے ہوئے ڈر آتے ہیں

لفظ بن کر مہ و خورشید کے جلوے نازش
میرے آئینۂ افکار کو چمکاتے ہیں

سنگریزہ تھا یا کوئی آنسو آنکھ میں صبح تک کھٹک کے رہا
رہ گئیں سب سکوں کی تدبیریں دل جہاں بھی رہا دھڑک کے رہا

یہ تیرگی کے مناظر یہ حادثات کے شہر
یہ دَور خاتمِ دوراں دکھائی دیتا ہے

بڑی مشکل اُٹھائی تم نہ آئے
قیامت روز آئی تم نہ آئے

گئی شامِ جدائی تم نہ آئے
اجل کی نیند آئی تم نہ آئے

نہ ٹوٹا تار میرے آنسوؤں کا
گھٹا گھر گھر کے آئی تم نہ آئے

گرائے رات نے شبنم کے آنسو
سحر بھی مسکرائی تم نہ آئے

مرے ذوقِ نظر کی رفعتوں سے
رہی ساری خدائی تم نہ آئے

چراغ آرزو کی عمر کب تک
بہت کچھ لو بڑھائی تم نہ آئے

تمہاری بے نیازی کی قسم ہے
قضا نازش کی آئی تم نہ آئے

پنجابی کے چند شعر

مرے دل دا دوآبہ سُک گیا مری حسرتاں اَج تڑپ دیاں نے
مری اکھاں توں راوی وگدا اے مرے ہنجواں دا رنگ چناب دا اے

اسی دیوا بال بیٹھاں گے کدی ساڈے وی ویہڑے آوے گا
اوہدا مکھڑا چن چودھویں ورگا روپ اوہدا سوہنے پنجاب دا اے

نیندر اکھیاں توں دُور رکھلدتی اے رات ہجر دی مکدی نئیں نازش
لوکی کہندے نے عشق کرو سجنو جیہڑا عشق دا کم اے ثواب دا اے

(مطبوعہ) نازش حیدری

کس نے ہر آرزوئے دل مری ٹھکرائی ہے
آج مجھ سے مری تقریبِ شناسائی ہے

ہر قدم پر مجھے کچھ تجربے ہوتے ہیں نئے
زندگی کیا ہے مری حوصلہ افزائی ہے

کتنی صدیوں سے وہ بے جان تھے پیوندِ زمیں
میری تحقیق سے ذرّوں میں توانائی ہے

ہر نفس یاد کسی کی ہے نمک پاش اب تک
زندگی کیا ہے مری، زخم شناسائی ہے

دونوں عالم بھی خریدار نہ ہو سکتے تھے
قیمتِ دل تو غموں نے مری ٹھہرائی ہے

چاندِ سورج کا توازن ہے ترے ہاتھوں پر
خطِ پرواز پہ ٹھہری ہوئی انگڑائی ہے

زندگی کا ہوں میں بے فیض صحیفہ نازش
بس سجاوٹ کیلئے حاشیہ آرائی ہے

وہ تو اب یہ سوچ رہا ہے دل ہی دھوکہ کھائے گا
برکھا رُت ہے اپنے گھر میں کون مجھے ٹھہرائے گا

کوئی پرندہ حبس میں رہ کر آزادی تک پہنچا ہے
سَر پر جب لپکے گا بادل شہپر کیا لہرائے گا

اتنی ہنسی کس بات پہ آخر، تم نے کیا دولت پائی
اتنا ہنسنا ٹھیک نہیں ہے، آنکھ میں آنسو آئے گا

لہریں چومیں گی قدموں کو ٹھنڈی ہوائیں گائیں گی
دن تو ڈوب چکا ہے کون اب ساحل پر چلائے گا

سایہ اجل کا دوڑ رہا ہے سارے زد میں آئیں گے
رونے والے کم تو نہیں ہیں کون کسے سمجھائے گا

دل کی امیدیں خون ہوئی ہے قسمت کی ناداری سے
قطرہ قطرہ ابر بہے گا موتی کیا برسائے گا

عمر گنوا کے ہم نے نازشؔ مایوسی ہی پائی ہے
لاد چلیگا بنجارہ جب، ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا

آج کا عہد

(پہلا یوم آزادی ۱۹۴۷ء)

آج کا جشن یوں منائینگے
سعیِ پیہم میں ڈوب جائینگے

آ اِدھر آ نگارِ پاکستان
آج تجھ کو دُلہن بنائیں گے

خُلد سے لے کے رنگ و رعنائی
ہم تری انجمن سجائیں گے

شام کی تلخیٔ حوادث میں
صبح کی چاشنی ملائیں گے

تو نے ہم سے نظر ملائی ہے
تجھ کو دیکھیں گے مُسکرائیں گے

زندگی کے شکستہ پیمانے
مئے تازہ سے جگمگائیں گے

اپنے تقدیر ساز ہاتھوں سے
بات بگڑی ہوئی بنائیں گے

ایک گہری نگاہ سے چھُو کر
ہوش میں زندگی کو لائیں گے

ہر گُماں کو یقیں سے شرما کر
خواب کو واقعہ بنائیں گے

راستے کی کٹھن چٹانوں میں
عزم کی ندیاں بہائیں گے

چاند تارے نئے تراشیں گے
اپنا سورج الگ بنائیں گے

بے حسی کا جمود توڑیں گے
شوق کے دائرے بڑھائینگے

تیرگی کے حصارِ کہنہ میں
اک نئی شمع ہم جلائیں گے

تیری زندہ مثال سامنے ہے
موت سے ہم نہ مات کھائیں گے

زندگی کا مزاج بدلیں گے
ہر فضا اس کو راس لائیں گے

انقلابات کی ہوا دے کر
بخت خوابیدہ کو جگائینگے

لمحے لمحے کا تجزیہ کر کے
وقت کو ضابطے میں لائینگے

جھنجھناتے ہیں سازِ وقت کے تار
ہم ترقی کے گیت گائیں گے

آرزوؤں کے رنگ محلوں میں
پرچمِ زندگی اُڑائیں گے

عزم کے مرمریں جزیروں تک
کشتیٔ عمر لے کے جائینگے

اپنی منزل پہ جا کے دم لیں گے
اور پھر لوٹ کر نہ آئیں گے

معمارِ قوم

جب ہوئی روزِ ازل بزمِ جہاں کی تشکیل

اور امکان کے سانچے میں ڈھلا عزمِ جلیل

عملِ پیہم و تنظیم و یقینِ محکم

کر دئے ایک ہی مرکز پہ ملائک نے بہم

امتزاج اُن کا ہُوا صورتِ انسانی میں

شرفِ خاص ملا محفلِ یزدانی میں

اس کو اک قوم کی ترتیب میں کام آنا تھا

انقلابات سے ہر گام پہ ٹکرانا تھا

ایک شعلہ تھا جو بجلی پہ جھپٹ سکتا تھا

ایک ملّاح جو دھارے کو پلٹ سکتا تھا

اس کے ہر سانس میں تھا ذوقِ عمل کا طوفاں

اس کی رگ رگ میں تھی احساس کی بجلی رقصاں

نکہتیں تازہ بہاروں کی اڑا لیں اُس نے

پتیاں پھول کی کانٹوں سے بچا لیں اس نے

اُس نے ہر دورِ مصائب کا جگر چاک کیا

ایک خطّے کو نیا روپ دیا پاک کیا

خاک سے اُٹھ کے پہاڑوں کو جھنجھوڑا اُس نے

دورِ گردوں کی کلائی کو مروڑا اُس نے

ذہنِ مسلم پہ درِ فکرِ رسا کھول دیا

دفترِ دہر میں اک باب نیا کھول دیا

خس و خاشاک کو تقدیرِ جبل دی اس نے
زندگی ٹھوس حقائق میں بدل دی اُس نے
آندھیاں آئیں تو جلتا ہی رہا اُس کا چراغ
آج تک سینۂ دشمن میں ہے اِس بات کا داغ
آج اس قوم کو تشویشِ فنا کچھ بھی نہیں !
اب یہ افسانہ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

قطعہ

دلّی بہت لٹی ہے مگر اس کا غم نہیں
سرمایہ ذہن کا مرے ماضی میں لٹ گیا
نازشؔ مری طرح نہ لٹا کوئی اہلِ زر
مجموعۂ کلام بھی دِلّی میں لُٹ گیا

وفاتِ قائدِ اعظمؒ

وہ کہ اس ملک کی تقدیر بنائی جس نے

نشۂ خدمتِ اسلام سے سرشار بھی تھا

لا کے منزل پہ ہمیں اس نے کیا مستحکم

وہی قائد تھا وہی قوم کا معمار بھی تھا

دلِ حسّاس ہیں اس کے تھی بڑی گنجائش

ملّتِ پاک کا ہمدرد بھی غمخوار بھی تھا

سرد و گرم اس نے زمانے کے بہت دیکھے تھے

صاحبِ عجز بھی تھا مومنِ خوددار بھی تھا

ادھر اپنوں سے اُدھر غیر سے تھا محوِ کلام

ایک ہی وقت میں وہ پھول بھی تلوار بھی تھا

ہم تصوّر میں کبھی یہ بات کبھی لا نہ سکے

اس قدر جلد وہ مرنے کا سزاوار بھی تھا

قوم کی ہے یہ امانت، نہ خیانت کرنا

اے لحد قائدِ اعظم کی حفاظت کرنا

شہیدِ ملّت لیاقت علی خاں

اک بزمِ نو کی سمت جہاں کی نظر اُٹھی

آئینہ آفتاب کا لیکر سحر اُٹھی

جذبات رقص میں تھے ترنّم لئے ہوئے

ہر گوشۂ حیات تبسم لئے ہوئے

فطرت کا راز بزمِ نمایاں میں آگیا

عزمِ جلیل صورتِ امکاں میں آگیا

زنجیرِ تیرگی کے وہ حلقے بدل گئے
لمحات جس قدر تھے شعاعوں میں ڈھل گئے

اک باغباں اٹھا نئے امکاں لئے ہوئے
فرمانِ اقتدارِ گلستاں لئے ہوئے

رنگِ بہار سے خطِ تنسیخ پھر گیا
دورِ خزاں گیا رُخِ تاریخ پھر گیا

پیمانے دستِ شاخ میں لبریز ہو گئے
پھولوں کے رنگ اور بھی کچھ تیز ہو گئے

نرگس نے آنکھ کھول کے جھک کر کیا سلام
سوسن نے مسکرا کے کیا سب کو لا کلام

کیا کیا چھلک رہے تھے کٹورے گلاب کے
فوارے جیسے نصب کئے ہوں شراب کے

لیکن یہاں ہنسی کا خطرناک طور تھا

ایسے بھی کچھ تھے جن کا ارادہ کچھ اور تھا

کانٹوں کا مشورہ تھا کہ پیکاں سنبھالئے

بولی خزاں کہ نظم گلستاں سنبھالئے

سازش نگاہِ برق سے کرلی بہار نے

کی اختیار صورتِ جبر اختیار نے

یہ دورِ گلستاں کا بغاوت اثر رہا

اک پھول باغباں کا لہو چوس کر رہا

محسن کُشی کے جرم کی تکمیل ہو گئی

سُرخی شفق کی خُون میں تبدیل ہو گئی

لائی تھی صبح جس کو بڑے اہتمام سے

آئینہ گر کے چُور ہوا دستِ شام سے

کچھ اور تیز گردشِ حالات ہو گئی

کرنوں کا جال ٹوٹ گیا رات ہو گئی

دہرائی جا رہی ہے سیاست یزید کی

بُو آ رہی ہے باغ سے خونِ شہید کی

زائرینِ حرم سے

قافلے عرش نصیبوں کے گئے اور آئے

اپنے ہمراہ دو عالم کی سعادت لائے

زائرینِ حرمِ پاک ہیں قسمت کے دَھنی

ان کے حصّے میں وہ دولت ہے کہ اللہ غنی

زائرو! آج بلندی پہ ستارا دیکھا

اوجِ تقدیر کا مقدور تمہارا دیکھا

اس طرح روضۂ اقدس کی زیارت کی ہے

باغِ فردوس کے دروازے پہ دستک دی ہے

رُک گئی جا کے نظر چشمۂ زمزم کے قریب

بجلیاں کوند گئیں دیدۂ پُرنم کے قریب

شوقِ وارفتہ کو آندھی کے مِلے جب اوصاف

ہو گئے ایک بگولے کی طرح وقفِ طواف

پُتلیاں آنکھ کی ہم رنگِ غلافِ کعبہ !

اور تقدیر کی گردش ہے طوافِ کعبہ

سنگِ اسود کو جو ہونٹوں سے چھُوا ہے تم نے

منجمد ابرِ کرم چوم لیا ہے تم نے

آہ وہ روضہ وہ ہر دورِ زماں کا مرکز

محورِ عشق وہ پرکارِ جہاں کا مرکز

روشنی ہو گئی اس طرح ہم آغوشِ جبیں

جالیاں نامۂ تقدیر کے الفاظ بنیں

کاش نازش بھی مدینے کی فضا میں جھومے
آستانِ شہِ لولاک کی چوکھٹ چومے
کاش ہو اس کی طرف بھی کبھی سورج کی نظر
جذب ہو جائے اسی خاک میں ذرّہ بن کر
کاش نظریں اسی روضے سے لپٹ کر سو جائیں
دیدۂ شوق کے حلقے بھی جھروکے ہو جائیں

تجدیدِ زمانہ

فرسودہ نظامِ بزمِ امکاں
سہمی ہوئی چال چل رہا ہے
صدیوں کے شباب کا پسینہ
تاروں کی جبیں سے ڈھل رہا ہے
تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

حوروں کی وہ ریشمی صدائیں
فطرت کی زباں سے سن رہا ہوں
کچھ تارِ نقابِ حسن لے کر
تخلیق کا راگ بن رہا ہوں
تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

پھیلے ہوئے کچھ جوان نغمے — بجلی کی طرح لپک رہے ہیں
تقدیرِ بہار کے فرشتے — نیندوں کے نشتے چھڑک رہے ہیں

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

بہتے ہوئے رنگ و بو کا دھارا — سیراب چمن کو کر رہا ہے
موتی سی دمک رہی ہیں کلیاں — دریائے خزاں اتر رہا ہے

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

تھک تھک کے بغاوتوں کے نعرے — لپٹے ہیں سکوتِ زندگی سے
آزاد فضا کا گوشہ گوشہ — مہکا ہے ثبوتِ زندگی سے

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

بیدار ہوئے ہیں کارخانے — چمنی سے دھواں اُگل رہے ہیں
افلاس کی تہ بہ تہ گھٹا میں — اب گھی کے چراغ جل رہے ہیں

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

نکھری ہے زمین کی جوانی　　احسان کو عام کر رہی ہے
اُٹھتی ہوئی فصل مُسکرا کر　　دہقان کو سلام کر رہی ہے

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

راہوں میں رواں دواں ہیں جلوے　　نکھری سی ہیں نقرئی فضائیں
ہر گام پہ رنگ رنگ مستی　　ہر سانس میں ہیں نئی فضائیں

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

اُس موڑ پہ آ گئے ہیں نازش　　ملتی ہیں جہاں سکوں کی راہیں
ذرّوں کو ملا ہے درسِ پرواز　　تاروں نے اُتار دیں کلاہیں

تجدیدِ زمانہ ہو رہی ہے

طلوعِ سحر

سحر نے رات کے پردے اُٹھائے

مناظر مسکرا کر جگمگائے !

چمن نکہت کے فوّاروں سے مہکا

شگفتہ رنگ غنچے رسمسائے

جہاں میں کھُل گئے کرنوں کے جھولے

طیورِ نغمہ پیرا چہچہائے

کِرن کے تار پر بزمِ سحر میں !

خموشی نے شگفتہ گیت گائے

بکھر کر آخری شب کے دُھندلکے

اُجالوں کے سمندر میں نہائے

سحرِ مشرق نے جب کھولا دریچہ
درختوں سے گرے گھبرا کے سائے

آفتابِ نو

اے وطن تیرا غبار آلود چہرہ دُھل گیا
ہر نَفَس میں ایک آزادی کا پرچم کھل گیا
عظمتِ تہذیبِ دیرینہ پھر آئی ہوش میں
زندگانی رقص کرتی ہے ترے آغوش میں
ذہن کی نشو و نُما فکر و نظر کی برتری
ارتقائی منزلوں میں زندگی کی رہبری
چہرۂ انسانیت کا غازہ انساں کا وقار
فطرتِ آدم کا جیتا جاگتا اِک شاہکار

قوم کی پسماندگی سے برسرِ پیکار ہے

تیر کی پرواز ہے چلتی ہوئی تلوار ہے

گرمیٔ دورانِ خوں زنجیر سے ٹکرا گئی

اب مزاجِ آتش و آہن میں نرمی آ گئی

بہتے دریا کا تموّج کوہساروں کا غرور

بے حجابانہ ہوا کے سرسرانے کا شعور

غنچہ و گل کا تبسّم، جام و مینا کی کھنک

مے کا بادل، کیف کی برسات، نغموں کی دھنک

کتنے لمحے خوش نصیبی کے حوالے ہو گئے

کتنے سائے تیرے دامن میں اجالے ہو گئے

ناچتی ہیں ذہن میں دہقاں کے کچھ پرچھائیاں

مسکراتی، لہلہاتی فصل کی انگڑائیاں

زیست کی لے شعلہ زن کہساریں وادی میں ہے

دشت و دریا میں ہے جنگل میں ہے آبادی میں ہے

تیرگی سمٹی چراغِ زیست کی لَو بن گئی

وقت کے ماتھے کی سِلوٹ جادۂ نَو بن گئی

آج تارِ ساز کی حد سے بڑھا جاتا ہے راگ

دائرے سے ضبط کے باہر ہوا جاتا ہے راگ

کیا ہے آزادی غلاموں کے لئے جینے کا حق

مسکرانے کا شرابِ غم رُبا پینے کا حق

آفتابِ نَو اُٹھا رخصت اندھیرا ہو گیا

موت سوئی، زندگی جاگی، سویرا ہو گیا

علامہ اقبالؔ

وہ ایک پھول کہ جس نے چمن کو مہکایا

وہ ایک شعلہ کہ جس نے دلوں کو گرمایا

وہ اک صدا کہ ہمیں خواب سے جگایا ہے

وہ اک پیام کہ ملّت کو ہوش آیا ہے !

وہ ایک دل کہ جو آگاہِ کبریائی ہے

وہ اک نگاہ جو ملّت کے کام آئی ہے

وہ ایک جذبہ کہ جو راہبر ہے سب کیلئے

وہ کوہسار کہ سینہ سپر ہے سب کیلئے

وہ اِک امنگ کہ رومیؒ کی بارگاہ ملی

وہ فلسفی کہ جسے بُوعلی کی راہ ملی !

وہ لَو کہ جس نے ہمیں جستجو شناس کیا

وہ آئینہ کہ ہمیں خود سے روشناس کیا

وُہ اک خودی کہ تصوّر وطن کا ہم کو دیا

وُہ ایک دُھن کہ سراغ اس چمن کا ہم کو دیا

وُہ سربلندیٔ شاہیں کہ جس کی اک پرواز

بتا گئی ہے مسلماں کو زندگی کا فراز!

نمو پذیر ان اجزا سے اک شعور ہوا

ہماری قوم کے اقبال کا ظہور ہوا

مرگِ انبوہ

(قاہرہ کا ہوائی حادثہ ۲۰؍مارچ ۱۹۶۶ء)

آہ وہ لمحۂ آغازِ سفر جس کا سکوں

لاکھ ہنگاموں پہ بھاری نظر آیا ہم کو

گو فضا میں انہیں پرواز کی آزادی تھی

دبدبہ موت کا طاری نظر آیا ہم کو

خیر مقدم یہ غریبانِ وطن کا دیکھا

مسکرا کر ملک الموت نے در کھول دیا

زندگی کا کوئی اس راہ میں ساتھی نہ رہا

وقت نے سانس لیا رختِ سفر کھول دیا

داخلِ مصر ہوا صبح کا تارا بن کر

قافلہ زیست کا تھا اپنے عدم کا غماز

ڈوبتے چاند کی کرنوں کا سفر ہو جیسے

شہپرِ مرگ پہ طیّارہ تھا محوِ پرواز

چند ساعت کے لئے آگ تھی پھر راکھ کا ڈھیر

اس "اُڑن پھُول" کو شعلوں کی زباں چاٹ گئی

جو مسافر تھے انہیں سانس کی مہلت نہ ملی

رشتۂ عمر کو مقراضِ اجل کاٹ، گئی

گو زلیخا نے دوبارہ یہیں پایا تھا شباب

زیست اس دور میں لیکن کوئی حق پا نہ سکی

زندگی بخش فضاؤں میں گھُلا تھا وہ زہر

یوسفِ جاں کو ہوا مصر کی راس آ نہ سکی

اُف وہ اہرامؔ وہ فرعون کے عبرت خانے

مرگِ انبوہ کے خاموش تماشائی تھے

ہائے وہ لوگ ہنسی جن کی تھی پیغامِ بہار
آج مرجھائے ہوئے لالۂ صحرائی تھے

انسان اور سائنس

قابلِ داد ہے انسان کا ذہنِ طرّار
ذرّے ذرّے پہ ہے سائنس کا اس وقت حصار
دسترس اس کی ہے پانی پہ ہوا پر قابو
رازِ ثابت رہے پنہاں نہ رموزِ سیّار
چھان کر ساری فضا چاند پہ ڈورے ڈالے
گرمیٔ عقل سے سورج پہ اُڑایا ہے غبار
خس و خاشاک سے تقدیرِ خزاں کی پوچھی
پتّی پتّی سے کیا تجزیۂ عہدِ بہار

چاک پہنائے زمیں کر کے نچوڑا دامن

حُسنِ تدبیر سے مٹی کا نکالا ہے نجار

سنگریزوں میں ہوئیں ساری چٹانیں تبدیل

آ گیا زیرِ قدم اس کے جہاں بھی کُہسار

منزلیں صرف اشارے پہ کھنچی آتی ہیں

بیٹھے بیٹھے ہی مسافر کی بڑھی ہے رفتار

ارتقا، "طائرِ آواز" کو بخشا اتنا

رہ کے محدودِ نشیمن ہوئی ہر سرحد پار

نظر افروز ہوئے ٹیلیوژن کے منظر

ہے تصور کی یہ تجسیم خرد کا شہکار

حُسنِ افلاک میں پائی ہے کشش انساں نے

اُلفتِ مشتری و زہرہ کا ہے وہ بیمار

اور تو اور منظر جانبِ مرّیخ بھی ہے

جب کہ اس طولِ مسافت کا نہیں کوئی شمار

کہکشائیں ہوں مسخّر یہ ہے خواہش اس کی

سورجوں کو بھی کرے کاوشِ پیہم سے شکار

"آبِ شور" اس کی حضوری میں ہے "آبِ شیریں"

تشنہ کامی کو بُرا سکتی ہے اس کی پتوار

آسمانوں کو بھی کر لے گا مُسخّر اک روز

عین ممکن ہے بدل دے وہ زمیں کا بھی مدار

ایک خود ساختہ سیّارہ اسے حاصل ہے

جس پہ جائے گا وہ خود حدِّ نظر کے اُس پار

اپنی ہر منزلِ مقصود کی جانب ہے رواں

ان پہ کر دیگا توانائیِ جوہر سے یہ وار

ں کی جب حوصلہ افزائی ہوئی فطرت سے

برتری لے کے نہ کیوں پائے زمانے میں وقار

از افق تا بہ افق عزم ہے جولاں نازش

دائرے کھینچتی رہتی ہے خرد کی پرکار

جنگل کی برسات

گل کے مناظر دیکھ ذرا وادی بھی ہے اور کہسار بھی ہے

وادی میں رواں ہیں چشمے بھی پانی کی چمکتی دھار بھی ہے

نی کے کنارے میلوں تک آتی ہیں نظر ابرق کی تہیں

کچھ جھلمل جھلمل ہے ایسی چاندی کا کنارا جس کو کہیں

جھوم کے اٹھا ہے بادل۔ برسا رم جھم رم جھم پانی

وہ بھی نہیں پہچانی جاتی جو شکل ہے جانی پہچانی

نتھے

بوندوں کے ~~ننھے~~ فوّارے آغاز میں ہیرے جڑتے ہیں

پتھّر کے جگر کی گرمی میں برسات کے جھنڈے گڑتے ہیں

بارش نے غبار آخر چھانٹا نکھرا منظر کہساروں کا

نالوں نے جاگ کے لی کروٹ تبدیل ہوا رُخ دھاروں کا

چھوڑی ہے گرفت آخر اپنی نالوں کی پُرانی کائی نے

چمکے بادل کے سائے میں ہر سو ابرق کے آئینے

سورج جو نہا دھو کر نکلا پیڑوں کہساروں سے اُبھرا

ہنگامے کے عالم میں چمکا نم دیدہ نظاروں سے اُبھرا

پتّوں نے شب بھر غسل کیا پھر صبح نے آ کر چمکایا

جو پیڑ کھڑے تھے حیرت میں اُن سب کو ہوا نے لہرایا

ہر دھارا تھک کر بیٹھ گیا بارش کا دباؤ ٹوٹ گیا

وہ ریت کناروں پر چمکی پانی کا بہاؤ ٹوٹ گیا

اب شوق بہاؤ کو یہ ہے مل جائے ندی نالوں سے

دیکھی ہے چٹانوں کی سیڑھی بھرپور اُترنے والوں سے

وہ اَبر چھٹا وہ دُور ہُوا جنگل کا سارا دھندلا پن

وہ دھوپ اُتر کر آنے لگی گرما گیا فطرت کا آنگن

سورج نے تعاون کی خاطر جنگل کو حرارت بھیجی ہے

بارش میں بھیگی دُنیا کو کرنوں سے تمازت بھیجی ہے

جنگل کی ہوائیں بوجھل ہیں اشجار کی شاخیں لوچ میں ہیں

اک فلسفی و شاعر کی طرح صدیوں سے چٹانیں سوچ میں ہیں

یوں فرد فرد ہو گئے احباب دل نواز!

لفظوں میں جیسے کوئی اضافت نہیں رہی

تیرے آنسو

تیری آنکھوں کی اَدھ کھِلی کلیاں	شبنمی شبنمی تھیں کس کے لئے
سلسلہ اب ہے آنسوؤں کا رَواں	تازیانہ ہے کس کی حس کیلئے

تیری بھیگی ہوئی سی یہ پلکیں	اوس برسا کے بن گئیں بادل
تابِ رخسار بھیکی بھیکی ہے	چاند پر ہلکے ابر کا آنچل

تیرے اشکوں نے مجھکو حکم دیا	نہ رُکے تیرے اشک کا سیلاب
مجھ پہ تعمیلِ حکم فرض ہوئی	قطرے قطرے کا دے رہا ہوں حساب

اشک ٹپکے ہیں میرے کاغذ پہ	اور نقطوں میں ڈھلتے جاتے ہیں
رُک کے دیتے ہیں کام نقطوں کا	پھیل کر دائرے بناتے ہیں

قطرے قطرے سے ابھری جاتی ہے	واقعاتِ گزشتہ کی تصویر
تیرے غم سے رہیگی وہ روشن	بہہ کے اشکوں نے کھینچ دی جو لکیر

دے ذرا اپنے آنسوؤں کو خبر — اشک رکتے نہیں ہیں نازش کے
غم کے بادل نہ چھٹ سکیں گے کبھی — دن ہمیشہ رہیں گے بارش کے

تیرے قہقہے

تیرہ شب کی سیاہ وادی میں — اُڑ کے جگنو چمکتے رہتے ہیں
یہ ترے قہقہوں کا پیہم رقص — سونا چاندی پگھل کے بہتے ہیں

تیرے ہونٹوں کی ایک جنبش میں — اُبھرے کتنے خوشی کے فوّارے
رفتہ رفتہ بڑھا ہنسی کا ہجوم — جوش کھا کر مچل پڑے دھارے

واہ یہ نعرۂ مسرّت خیز — ہنستے پھولوں کی ایک تانِ دراز
ایک غنچے کے کھلکھلانے سے — ہے بہاروں کی دُور تک آواز

ہائے یہ کاروانِ تیز قدم — ایک طوفانِ شادمانی ہے
ہے یہ تیری شگفتگی کی دلیل — کشتیِ دل کی بادبانی ہے

یہ ترے قہقہوں کا عزمِ فراز　　دامنِ کہکشاں کو چھُو آئے
اور جب میرے پاس سے گزرے　　دل پہ لہرائے جاں کو چھُو آئے

رنگ و بو کی یہ تندئ پرواز　　تیرے گلزار کی نوازش ہے
مل گئیں جنّتیں سماعت کو　　مترنّمِ مزاجِ نازش ہے

گیت ـــــ چندا نگر

چندا نگر میں ہم کو بلائے ہنس ہنس کر آکاش کا چاند

آؤ سکھیو رِل مل کر گائیں　　رِل جُل کر تاروں پر چھائیں
چاند کو میٹھے گیت سُنائیں　　کرنوں میں ہنس کر اُڑ جائیں

چندا نگر میں ہم کو بلائے ہنس ہنس کر آکاش کا چاند

چاندی کے ساگر میں دُھل کر　　چندا کی کرنوں میں تُل کر
کرنوں کی صورت کُھل کُھل کر　　آؤ چلیں اوپر رِل جُل کر

چندا نگر میں ہم کو بلائے ہنس ہنس کر آکاش کا چاند

سامنے ہے تاروں کی ٹولی   اُن سے کھیلیں آنکھ مچولی

چاند نے ہر سو چاندی گھولی   بھیجی ہے کرنوں کی ڈولی

چندا نگر میں ہم کو بلائے ہنس ہنس کر آکاش کا چاند

گیت ــــ ساون

ساون رُت کی جھانجن باجے   چھم چھم چھم چھم آنگن باجے

صحرا باجے گلشن باجے   پات کی تھالی پر بَن باجے

ساون رُت کی جھانجن باجے

آگے پیچھے بوندیں آئیں   ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں چھائیں

جو آکاش کے جھونکے لائیں   دل کی اُمنگیں سب مہکائیں

ساون رُت کی جھانجن باجے

ترچھی بوندیں ٹیڑھی گلیاں لہراتی ہے وادیٔ مہراں
جھونکے پون کے نکلے غزلخواں ناچتی ہیں برکھا کی پریاں

ساون رت کی جھانجھن باجے

نقادِ سخن مولانا حامد حسن قادری

ہوا جب ازل میں ظہورِ حیات اور انساں بنا زینتِ کائنات
بنے لفظ اظہارِ حالات کو جہاں میں لگے پر خیالات کو
زبانوں کی تسکین ہونے لگی ادب کی بھی تدوین ہونے لگی
ملا آدمی کو شعورِ سخن مہذب نظر آئی ہر انجمن
اٹھے ساتھ نقاد بھی صف بصف جو تھے رہنمائی کو مشعل بکف
بڑھا قافلہ شعر کا ناگہاں کہ سائے میں تنقید کے ہو رواں
اندھیرے نہ پائے گئے راہ میں ستارے بچھائے گئے راہ میں
عروسِ ادب کو سنوارا گیا حقائق کا چہرہ نکھارا گیا
نظر اس پہ نقاد کی چھا گئی نگارِ غزل کو ہنسی آگئی

اسی صف میں تھے حضرتِ قادری
عطا جن کو قدرت نے کی برتری

کسی پر جہاں کوئی تنقید کی
تو پختہ شعوری نے تائید کی

جو اغلاط بر خطِ تنسیخ تھے
جو تاریخ گوئی کی تاریخ تھے

لگایا ادب کو رہِ راست پر
کہ طے عافیت سے ہو اس کا سفر

خطاؤں سے روحِ خطا کھینچ لی
غلط کاوشوں کی ردا کھینچ لی

غرض یہ کہ نقاد نقاد ہے
ہر استادِ فن کا وہ استاد ہے

آہ مولانا ماہر القادری مرحوم و مغفور

اس جہاں میں ہیں گم دو جہاں اور بھی
دو طرح کے ہیں اسلوب بھی طور بھی
یعنی نیکی بدی کے ہیں کچھ دور بھی
قابلِ فہم بھی قابلِ غور بھی

ہائے ماہر جو تھا پھول میں رنگ و بُو
اس کے دم سے شرافت کی تھی آبرو

فخر تھا اس کی ہمسائیگی پر مجھے!
ناز تھا ماہر القادری پر مجھے
تھا یقیں دانش و آگہی پر مجھے!
رشک تھا علم کی روشنی پر مجھے

بن کے خوشبو گلِ آرزو سے مِلا
ایک دریا تھا جو آبجو سے مِلا

مسکراہٹ کی اک موج ہونٹوں پہ تھی
ہائے نازاں رہی اُس پہ خود زندگی
دوست تھا اجنبی کا نہ تھا اجنبی
برگزیدہ رہی اس کی یہ دوستی

منفرد اس صحیفے کے اوراق تھے
قابلِ قدر اخلاص و اخلاق تھے

شعر بے لوث تھے اور تنقید بھی
تھی بلا خوف تائید و تردید بھی
رہبری بھی رہی اور تقلید بھی

بے ادب کو رہی اس کی تاکید بھی

اس کا کردار آلودہ دامن نہ تھا
دوست تھا وہ غلط گو کا دشمن نہ تھا

وہ سراپا پیمبر کا پیرو رہا
سربسر تھا جہاں حمد کا نعت کا
لب پہ مدحت رہی دل میں خوفِ خدا
سینۂ لفظ میں گنجِ معنی وہ تھا

سو گیا خاکِ ارضِ حرم اوڑھ کر
اب اٹھے گا ردائے کرم اوڑھ کر

روز و شب بڑھ کے ٹکرائے دیوار سے
روز اڑے رنگ و بو صحن گلزار سے
گردشیں رک گئیں اس کے کردار سے
وہ چمکتا رہا اپنے انوار سے — !

پھول تھا زیبِ باغِ ارم ہو گیا
نور تھا نور میں جا کے ضم ہو گیا

اب چمن میں نہیں ہے وہ جوشِ نمو
آنکھ پھولوں کی بھی رو رہی ہے لہو
ہے مہ و مہر کو بھی یہی جستجو،
کاش دے ہم کو خاکسترِ آبروؔ

اے کہ تو ہے فرشتوں سے اب ہمکلام
نازشِؔ حیدری کا بھی پہنچے سلام

قطعہ تاریخ وفات

گراں شد غمِ ماہرؔ القادری
کسے در زمانہ نگیرد ثبات
ز تاریخ نازشؔ چو واقف نبود
قضا گفت "گل شد چراغِ حیات"

۱۹۷۸ء

وہ شاعر وہ ناقد وہ زیرک فہیم
وجود اُن کا تھا نازشِ زندگی
وہ اخلاق عالی کہ حیراں ملک
رہی عمر بھر ان کے لب پر ہنسی
تخیّل کے شہپر تھے یا موجِ نور
سرِ عرش بھی انکی پرواز تھی

تلاش اُن کی نازشؔ رہی تا حرم
بسے خلد میں ماہرؔ القادری،

۱۳۹۸ھ

قطعۂ تاریخ بر وفات حضرت صوفی تبسمؒ (لاہور)

آہ شاعرِ یکتا ، نکتہ دان لاثانی

راہِ زندگی میں وہ ہو گیا کہیں گُم آہ

اب خوشی کا ہر پہلو ہو گیا ہے غم نازشؔ

ماتمِ تبسّم آہ ، ماتم تبسّم آہ!

۱۹۷۸ عیسوی

نازشؔ حیدری

حافظ اکبر درّانی (حیدری)

حافظ نیک خُو وہ درّانی — ٹوٹنا ہائے جاں کے ساغر کا

کہیئے دو بار مصرعۂ تاریخ — آہ! نازشؔ فراق اکبر کا

۱۹۷۸ء

قطعہ تاریخ سراج الدین ظفر مرحوم

وہ شاعرِ غزالاں وہ رندِ پاک طینت
ہیں ہم نشین ظفر کے ماتم میں آبدیدہ

ہر چند اُسکی میت ہے زیبِ دوش نازش
دیکھا غزالِ جاں کو جنت میں آرمیدہ
۱۹۷۲ء

قطعۂ تاریخ محمد ادریس تابش نازشی شجاع آبادی مرحوم

وہ حکیم و شاعرِ نکتہ شناس
زندگی بھر جو رہا دل کے قریں

نازشِ غمگیں یہ لکھ سالِ وفات
اب ہے تابش رونقِ خلدِ بریں
۱۹۷۳ء

رباعیات

جیتا ہوں مگر جینے پہ ہے شک ساقی
ہر لمحہ رہی زیست سے کھٹک ساقی
ساغر کی کھنک سے اُسے کر دے تبدیل
دروازے پہ ہے موت کی دستک ساقی

بے نغمہ جواب سازِ توانائی ہے — غمّازی حالات کی انگڑائی ہے

کہتی ہے یہ بالوں کی سفیدی بہ نازش — اُٹھ خواب سے گھر میں ترے دھوپ آئی ہے

خالی کبھی رہا کیا ہے گردش میں ایاغ — سلگا کبھی رہا ہے برفباری میں دماغ

ہر وقت رہی حیات کی سرگرمی — تیز آندھیوں کی زد میں رہے جیسے چراغ

جھرمٹ ہمیں خوش رنگ جزیروں کا ملا — اک سلسلہ رنگین ذخیروں کا ملا

حیدر کے کلام پر جو نظریں پہنچیں — انبار تراشے ہوئے ہیروں کا ملا

MY Lovely Pretty Home.

The waves Are Furious Towering wide
And stonesAnd Rubbish Thrown Aside
The River Tied with ____ Every Tide
Obstructing Rocks Now Tempt To Hide
MY Lovely Pretty Home

Nazish Haidry (composed In Iraq 1939)

چمن از خس برآوردہ چگونہ ساحری کردہ

حواسِ خفتہ را بیدار از رامشگری کردہ

ہویدا در دلِ حسّاسِ ما او ابتری کردہ

بسوئے شبنمستاں آمدہ شعلہ گری کردہ

میانِ ہر دو عالم محو کرد او امتیازے را

بہ دَیر آراستہ سجدہ، بہ کعبہ بت گری کردہ

شدند از غیب حاصل جملہ اسبابِ خود آرائی

ہوائے شوق رقصیدہ نقابش خودسری کردہ

بہ بیں ایں مصلحت اندیشیٔ ذوقِ محبّت را

پئے تسکینِ منم سجدہ بہ سنگِ آذری کردہ

حجاباتِ تحیّر سوختہ، نغمہ بلب آمد

دِلم از شاعری دم زد چہ نہ شد دیدہ وری کردہ

بپاسِ خطّۂ لاہور تجدیدِ سخن کردم!

بحکمِ "انقلابِ نو" چنانم شاعری کردہ

بیاد آوردہ ام فرمودۂ اقبالؔ را نازش

تپش از شعلۂ خود دادہ و ہم رہبری کردہ

ملنے کا پتہ

مکتبۂ حیدری

۵ - ای ۲۲/۱ بڑا میدان ناظم آباد

کراچی ۱۸

یا

نازش کدہ

پلاٹ نمبر ۲ سی - بلاک ۳

لیاقت آباد

کراچی ۱۹